سیدہ آمنہ بہار

اردو نظم میں کشمیر، ۱۹۴۷ء تک

کشمیری ادبیات کے معروف محققین اور نقادان ادب پنڈت پریم ناتھ بزاز، میر غلام احمد کشفی، محمد الدین فوق، ڈاکٹر صابر آفاقی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر حمید ممتاز، ڈاکٹر یوسف بخاری وغیرہ نے کشمیری ادبیات کی زمانی تقسیم کی ہے اس کے مطابق کشمیری ادبیات کو چار بڑے ادبی ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا دور: شتی کنٹھ، للہ عارفہ اور شیخ نورالدین

دوسرا دور: حبہ خاتون سے ارنی مال تک

تیسرا دور: محمود گامی سے وہاب پرے تک

چوتھا دور: مہجور سے شروع ہوتا ہے۔ اسے بیسویں صدی کا دور بھی کیا جاسکتا ہے۔[۱]

جہاں تک خالص اُردو شعر و ادب کی تاریخ کا تعلق ہے، اس کو تین اہم ادوار میں تقسیم کا جاسکتا ہے:

اوّل: کشمیر کی سیاسی تقسیم (۱۹۴۷ء) سے پہلے کا دور (یعنی متحدہ کشمیر کا دور)

دوئم: ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۰ء تک کا دور (یعنی بیسویں صدی کے نصف آخر کا دور)

سوئم: ۲۰۰۰ء کے بعد کا عرصہ (یعنی اکیسویں صدی کے موضوعات رجحانات کی تشکیل سازی کا دور)

ان تمام ادوار نے نثر نگاروں کے علاوہ لل دید (للہ عارفہ)، نندرشی، حبّہ خاتون، حبیب اللہ نوشہری، ارنی مال، سوچھ کرال، محمود گامی، صائب، رسول میر، مقبول کرالوی، حسن شاہ، نورالدین عرشی، عبدالاحد ناظم، شمس فقر، عبدالوہاب پرے، وازہ محمود، پیر عزیز اللہ حقانی، شمس الدین حسرت، سوامی پر مانند، مقبول شاہ کرالرواری، پیرزادہ غلام قادر مہجور، عبدالاحد آزاد، غلام احمد فاضل، محی الدین حاجنی، عبدالرحمان راہی، رسل میر، رسا جاودانی،، وہاب کھار، اسد میر، غلام نبی دلسوز، احمد میر، احمد زرگر، غلام رسول نازکی، حسین علی انصاری، دینا ناتھ نادم، غلام نبی عارض، غلام محمد اُلفت، تیا میر ناتھ فانی، غلام احمد مقبول، حضر مغربی، غلام نبی فراق، غلام احمد ناز، امین کامل، عبدالخالق ٹاک زینہ گری، غلام محمد بڈگامی، نشاط انصاری، مشعل سلطان پوری اور غلام نبی خیال جیسے اہم کشمیری شاعر پیدا کیے جن کے رنگِ کلام اور طرزِ فکر کی روشنی میں اردو شاعری کی ہئیت

پروان چڑھی اور کشمیر میں اردو شعر و ادب کو بنیادی ڈھانچا ملا اور یہاں شعری نظام کو موضوعات اور رجحانات کی بہم رسائی میں کشمیری زبان کے ان شاعروں سے بہ منزلہ استفادہ کیا گیا ہے۔[۲] کیوں کہ کشمیری زبان اور اس کا شعری سرمایہ ایک مکمل ادبی روایت کے طور پر اردو زبان و ادب کی ساخت و پرداخت سے پہلے اپنی ایک مکمل شناخت بنا چکا تھا اور اپنی قدریں متعین کر چکا تھا۔

کشمیر میں اردو کے شعری ادب کی تاریخ کا جائزہ لینے کے لیے ریاست کے فارسی ادب کی روایت کا ایک جائزہ لینا بھی ضروری ہے کیوں کہ یہاں کا فارسی شعری ادب اپنی ایک توانا روایت رکھتا ہے۔ جس نے غنی کاشمیری جیسے یگانہ روزگار فارسی شاعر کو جنم دیا ہے جو فارسی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یوں تو فارسی زبان کا رواج شاہان شہمیر اور چک سلاطین کے وقتوں سے ہو چکا تھا اور فارسی کو شاہی سرپرستی حاصل تھی جس بنا پر کئی نام ور شاعر اور مصنف اطمینان اور فراغت کی زندگی بسر کرتے ہوئے فارسی ادب کے مجموعی تخلیقی و شعری سرمائے میں اضافے کا باعث بنے۔ کشمیر میں فارسی شاعری کو سمجھنے کے لئے سید حسام الدین راشدی کا 'تذکرہ شعرائے کشمیر' کا مطالعہ بہت مددگار ثابت ہوسکتا ہے جسے اقبال اکیڈمی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ اس تذکرے میں کشمیر کے ۲۰۰ فارسی شعراء کا ذکر ہے جن میں چند اہم ناموں میں، امیر کبیر سید علی ہمدانی، محمد صالح کشمیری، پنڈت کیلاش کول صبا، غنی کاشمیری، نافع، ملا فانی، ملا احمدی، ملا صبیح، شیخ یعقوب صرفی، پنڈت بیرمل، سکون سخن مل، محمد افضل سرخوشی، لطف اللہ بیگ صبا، آغا عبدالعلی تحسین، مولانا صدی کاشمیری، پنڈت تاب رام بیتاب، پنڈت وید لال در طالع، پنڈت ہری کول حضوری، میر طاہر علوی، طاہر کاشمیری شامل ہیں[۳]۔ اس تذکرے میں چند غیر کشمیری شعرا کے کشمیر کے حوالے سے قصائد اور منظومات شامل ہیں۔ یہاں ملک الشعرا فیضی فیاضی کے کشمیر کے بارے میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

هوائے اُو متنوع چو فکرتِ نقاش   زمین او متلون چو صفحہ تصویر
بتن موافقت آب اُو، جو بادہ وگل   بجاں مناسبت باداو چو شکرو شیر
نسیم اُو، ز سرِ آب، تیز میگزرد   کہ باد را،نتواں داشت ،پای در زنجیز
بجلوہ ہائے فریب، آہوان مشکینش   زمین او ،چودل بیغماں،طرب خیزاست
سپہر کردہ مگر خاکِ اُو ، ببادہ خمیر[۴]

کشمیری اور فارسی کے علاوہ مسلمانان کشمیر کی مذہبی زبان یعنی عربی کے ادب کا بھی کشمیری ادبیات میں ایک وقیع ذخیرہ موجود ہے۔ اس ادب نے بھی کشمیر میں اردو زبان کے شعر و ادب کے خدوخال استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج ایران اپنے فردوسی، حافظ، رومی اور نظامی پر بہت ناز کر رہا ہے۔ مگر کشمیر

بھی شائق، غنی، کامل، صرفی پر فخر کرنے میں اس سے کچھ کم حق بجانب نہیں، عبدالوہاب شائق نے شاہنامے کی طرز پر کشمیر کی ایک منظوم تاریخ تصنیف کی جو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ غنی کا دیوان کشمیر کی حدود سے نکل کر ہندوستان اور ایران تک پہنچا اور استادانِ فن سے اپنے کمالات کا اعتراف کراتا رہا اور باوجود اس کے کہ فارسی شاعری میں صدہا انقلابات آئے، غنی کی زبان کو انقلاب کی ہوا سے کوئی گزند نہ پہنچا اور آج سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے کلام پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ مرزا اکمل الدین بیگ کامل کی مثنوی بحرالعرفان صوفیانہ خیالات کے لحاظ سے عدیم النظیر چیز خیال کی جاتی ہے۔ ملا یعقوب صرفی، ملا بہاؤالدین متو بہا، ملا اشرف دائری بلبل اور ملا حمید اللہ حمید کاشمیری شاہ آبادی کے خمسے ابھی تک طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئے مگر وہ بھی لاجواب چیزیں ہیں۔ یوں تو حکومت اسلامیہ کے ساتھ ہی فارسی زبان کشمیر میں پہنچ گئی تھی مگر اس کی ترقی کا اصل دور سلطان قطب الدین، سلطان سکندر اور سلطان زین العابدین عرف بڈ شاہ کے عہد میں شروع ہوا[۵]۔

کشمیر میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقاء کی کہانی زیادہ پرانی نہیں۔ کشمیر میں ۱۸۴۶ء میں قائم ہونے والی ڈوگرہ آمریت کے آغاز کے بہت بعد تک ریاست میں دفتری زبان فارسی ہی رہی، تاہم اس امر میں بھی کلام نہیں کہ جموں و کشمیر میں اردو زبان کے آغاز نفوذ کا دور بھی یہی ڈوگرہ دورِ آمریت ہے، اس ضمن میں معروف کشمیری دانش ور اور مورخ خواجہ غلام احمد پنڈت لکھتے ہیں کہ 'حتیٰ کہ ڈوگرہ عہد میں جب اس (اردو) کا یہاں آغاز ہوا اس نے ہر سطح پر اپنا سکہ منوا لیا اور دفتری زبان کی حیثیت فارسی کی جگہ لے لی۔ حتیٰ کہ عدالتی اور درسی زبان کا درجہ بھی پا لیا'[۶]۔ کشمیر کے ایک معروف دانش ور اور صحافی غلام نبی خیال نے اپنے ایک تحقیقی مقالے 'محمود گامی' میں محمود گامی کی اس غزل کو کشمیر میں اردو کے شعری ادب کا نقش اول قرار دیا ہے:

الحمد اللہ کہ مرا یار اچھا ہے ۔۔۔ جانانہ ، زلیخانہ ، چومستانہ آمد
اکھیاں کو جو دیکھوں تو خمار اچھا ہے ۔۔۔ بربرگ گل تازہ عرق انی شبنم
درلعل بیش گو ہر شہوار اچھا ہے[۷]

ڈاکٹر افتخار مغل نے اپنے مقالے 'کشمیر میں اردو شاعری۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ' میں غلام نبی خیال کے اس دعوے کو مسترد کیا ہے کہ محمود گامی کی متذکرہ بالا غزل کشمیر میں اردو شاعری کا نقشِ اول ہے ان کی تحقیق کے مطابق آزاد کشمیر کے شہر میر پور کے ایک شاعر شیخ غلام محی الدین میر پوری کو یہ اعزاز جاتا ہے جنھوں نے محمود گامی (۱۷۶۵۔۱۸۵۵ء) سے ڈیڑھ صدی پہلے ۱۷۱۷ء میں ایک مثنوی "مثنوی گلزار فقیر" کے نام سے لکھی:

کلمہ پاک یہ ختم کلام ۔۔۔ نیک مبارک سعد تمام
تخمیناً یہ نیک کلام ۔۔۔ چار پہر میں ہوا تمام

یہ نسخہ جب تھیا تمام　　گلزار فقیر کا ہویا نام ۸؎

ڈاکٹر افتخار مغل اس مثنوی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ یہ بات بہت دل چسپ ہے کہ محمود گامی محولہ بالا غزل سے تقریباً ڈیڑھ صدی قدیم ہونے کے باوجود محی الدین میرپوری کی اس مثنوی کی زبان گامی کی فارسی آمیز غزل کی زبان سے زیادہ فصیح اور سلیس ہے۔ان مباحث سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اٹھارہویں صدی کے آغاز سے بیسوی صدی کے آغاز تک نہ صرف یہ اپنا تشخص بنا چکی تھی اور عوامی سطح پر مقبولیت بھی حاصل کر گئی تھی بلکہ اپنے ایک الگ دبستان کے خدوخال بھی تشکیل دینے لگی تھی۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بیسوی صدی کے آغاز تک جموں میں دو بڑی ادبی تنظیمیں قائم ہوچکی تھیں۔یعنی ''بزم سخن'' جموں (۱۹۰۹ء) اور "بزم مشاعرہ" جموں (۱۹۱۴ء)۔ بزم سخن کے بانیوں میں غلام حیدر چشتی، مرزا مبارک بیگ، عبدالحکیم، قاضی شمس الدین اور مفتی مبارک احمد وغیرہ کے نام اہم ہیں جب کہ بزم مشاعرہ کے ارباب بست کشاد میں سردار وزیر محمد، صاحبزادہ محمد عمر، سردار محمد عالم خان، شیخ غلام نقشبندی، مفتی غلام علی حسرت اور غلام حیدر خان غوری وغیرہ شامل تھے۔۹؎

اس روایت نے کشمیری نثر نگار اور شاعروں کی جس کھیپ کو جنم دیا اس کی فہرست تو بہت طولانی ہے اور اس فہرست میں سب سے اوپر وہ شاعر آتا ہے جو اردو شاعری کی آبرو ہے، یعنی علامہ اقبال۔ اردو شاعری کے معیار و مقدار دونوں کا بھرم بہت حد تک کشمیری الاصل شاعروں کا مرہون منت ہے لیکن ''کشمیرالاصل'' کی بحث سے الگ ہو کر اگر محض ان کشمیری شعرا کی فہرست ہی مرتب کر لی جائے جن کا جینا مرنا کشمیر سے وابستہ رہا تب بھی کشمیر میں اردو کا شعری ادب کسی قسم کی معذرت خواہی کا سزاوار نہیں۔حبیب کیفوی نے اپنے مقالے ''کشمیر میں اردو۔جموں و کشمیر کے اردو شعرا'' کے عنوان سے جو فہرست پیش کی ہے ان میں علامہ اقبال، پنڈت برج نرائن چکبست کے نام بھی درج کیے ہیں جو کشمیرالاصل ہونے کے باوجود کشمیر سے باہر پلے بڑھے ہیں۔ان کی دیگر شعرا کی طویل فہرست میں شامل کچھ اور شعرا، اثر صہبائی، آزر عسکری، چراغ حسن، انجم خیالی، احمد شمیم، الطاف قریشی، برق کاشمیری، طاؤس بانہالی، طالب گورگانی، شجر طیرانی، قمر مرازی، قیس شروانی اور صابر آفاقی جیسے لوگ شامل ہیں۔جموں کشمیر میں اردو شاعری کی ساخت و پرداخت کا یہ اجمالی خاکہ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس امر کا اندازہ ہوسکے کہ کشمیر بطور ایک استعارے کے اردو شاعری میں اپنی جگہ پیدا کرنے میں کن مراحل سے گزرا ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ کشمیر میں اردو کی بنیاد سازی میں فارسی شاعری کی چھ سو شعرا پر مشتمل طویل اور ثروت مند روایت کا ایک کلیدی کردار ہے، جب ہم اردو شاعری کے تخلیقی، فکری سرچشمے یعنی فارسی شعری

روایت کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو نہ صرف اس روایت کے حجم، معیار اور مقدار کے حوالے سے ایک ثروت مندی بلکہ ایک حیرت انگیز فخر و اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر بھی بہت تسلی ہوتی ہے کہ فارسی شاعری میں "کشمیر" ایک مقبول مضمون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلیغ استعارے کے طور پر جاری و ساری ہے۔ عُرفی اس مضمون کو یوں باندھتا ہے:

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید گرمرغ کباب است کہ بابال و پر آید ۱۰

حاجی محمد جان قرشی کا والہانہ انداز تحسین ملاحظہ ہو:

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر کہ سرسبز د بہشت از خاک کشمیر
چہ کشمیر آبروئے ہفت کشور نگاہ از دیدن اُو تازہ و تر ۱۱

ظفر خاں احسن (جو کشمیر کا صوبہ دار بھی رہا) کشمیر کو یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

ہزاراں گلشن از ہر کنار است کہ مرغ دست آموزش بہاراست ۱۲

بطل کشمیر غنی کاشمیری کا انداز تحسین ملاحظہ ہو:

حسن سبزے بہ خط سبز مرا کرد اسیر دام ہمرنگ زمیں بودگرفتار شدم ۱۳

سید محمد زمان راسخ کہتے ہیں:

زگلگشت چمن بیروں چوآں سروخراماں شد کشاد بال بلبل باغ راچاک گریباں شد ۱۴

محمد رضا مشاق کا شعر دیکھیے:

چشم لیلی کہ دل ز مجنوں بُرو داغ از لالہ زار کشمیر است ۱۵

خواجہ حسن شعری نے کہا:

بسکہ رنگین بہار کشمیر است سوزن لعل و خار کشمیر است ۱۶

خواجہ حسن شعری کے اس مضمون کو سرزمین کشمیر کے ایک اور بیٹے، اقبال نے یوں بیان کیا۔

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز ست ۱۷

پروفیسر شیخ عطاءاللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

اقبال سے پہلے کشمیر کی سب سے بڑی تعریف یہ تھی:

اگر فردوس برروئے زمین است ہمیں است وہمیں است

لیکن کشمیر کو فردوس ہونے کا ثبوت علامہ ہی نے بہم پہنچایا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اب رہتی دنیا تک کشمیر کی اقبالی تعریف قطعی چیز ہوگی:

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را   نہاد است در دامن کوہسارے ۱۸

فارسی زبان کے سیکڑوں غزل نگاروں کے کشمیر کے حوالے سے ہزاروں اشعار کہے اس ثروت مندانہ پس منظر کو دیکھ کر یہ توقع کرنا قطعی بے جا نہیں ہے کہ اردو شاعری میں بھی کشمیر کی حکایت شیریں اسی ثروت مندی سے بیان کی گئی ہوگی۔ بات کشمیر کے حوالے سے لکھی اردو منظومات کی حد تک ٹھیک ہے لیکن جب ہم یہی توقع اردو غزل سے وابستہ کرکے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں قدرے مایوسی کا احساس ہوتا ہے، اردو غزل میں کشمیر بطور مضمون موضوع اور بطور علامت استعارہ اس ثروت مندی سے نہیں آیا۔ اس کی کوئی معقول اور قابل فہم وجہ نظر نہیں آئی شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اردو غزل نگاروں نے فارسی کے غزل گوؤں کی طرح کشمیر کی سیر و سیاحت کے لیے رخت سفر نہیں باندھا۔ میر کی شاعری میں باغ و بلبل چمن و نشیمن کا استعارہ اس قدر وقیع ہے کہ ان کی شاعری کا ایک حصہ ہی باغ و راغ، بلبل و آشیاں، قید و قفس، سبزہ و جوئے کوہسار اور برگ و شجر کے استعاروں پر استوار ہے اگر ان علامات کا کشمیر کے ساتھ کوئی تعلق دریافت کرلیا جائے تو کلام میر کا ایک متعدد بہ حصہ ہی کشمیر سے متعلق ہو جاتا ہے لیکن ابھی میر کی فکر اور ان کے حالات زیست میں اس طرح کا کوئی تلازمہ دریافت نہیں ہوا۔

آتش کی شاعری میں سفر و حرکت اور سبزہ و شجر کا بڑا غلغلہ ہے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی فکر کا سفر و حرکت کا پہلو انھیں باغ کشمیر تک کھینچ پایا نہ ان کی شجر و سایہ سے محبت و مودت انھیں چھتنار اور سایہ دار چناروں کی دھرتی کی طرف لائی۔ حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ انھوں نے محض قافیے کے طور پر بھی لفظ کشمیر کو نہیں باندھا حالانکہ ان کے ۲۶ شعر کے ایک دوغزلے میں ''میر و تقدیر و شمشیر و زنجیر'' کا قافیہ آیا ہے لیکن ان دو غزلیات میں بھی ''کشمیر'' کے ہم وزن و ہم آواز الفاظ میں سوائے ''کشمیر'' کے اردو و فارسی اور عربی زبانوں کا شاید ہی کوئی لفظ بچا ہوگا ایسا لگتا ہے کہ انھیں یہ لفظ سوجھا ہی نہیں اور اگر یہ لفظ (قافیہ) سوجھا بھی ہے تو مضمون نہیں سوجھا (درآں حالکہ آتش و ناسخ کے زمانے میں قافیہ پیمائی کا یہ عالم تھا کہ کوئی لفظ جو قافیے کے طور پر باندھا جاسکتا ہو، اس کا چھوٹ جانا بہت ''بدذوقی'' سمجھا جاتا تھا، متذکرہ دوغزلے کے مطلعے یوں ہیں:

تیری کاکل میں پھنسا ہے دل جوان و پیر کا   سیکڑوں آزاد ہے پابند اک زنجیر کا

اور

عالم منطق مصور ہو تری تصویر کا   منہ کتابی قطعی ہے، خط حاشیہ ہے میر کا ۱۹

کشمیری پنڈتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے چاہے جس حصے میں چلے جائیں اور کشور کشمیر سے نکلے ہوئے ان کی چاہے کتنی ہی نسلیں گذر جائیں وہ کشمیر کو، اس کی بو باس کو، اس ہواؤں اور فضاؤں

کو، اس کی وادیوں اور کوہساروں کو اور اس کے ماحول و مناظر کو نہیں بھلا سکتے کیوں کہ کشمیر تو کشمیری پنڈتوں کے لہو میں بہتا رہتا ہے ان کی دھڑکنوں میں بولتا رہتا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی معرکتہ الآرا اور مشہور عالم مثنوی ''گلزار نسیم'' اردو ادب کے عظیم ترین کلاسیکی شاہکاروں میں سے ایک ہے ''گلزار نسیم'' میں لفظ ''نسیم'' اگر چہ دیا شنکر نسیم کے تخلص کی مناسبت سے ہی اپنی تفہیم رکھتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ ''گل بکاؤلی'' کی کہانی تخلیق کرتے ہوئے کشمیری تخلیق کار کے زہن میں ''جنتِ ارضی'' یعنی اس کی مادر وطن، بہاروں اور نظاروں کی دھرتی، کشمیر کا ''نسیم باغ'' نہ ہوگا ''گلزار نسیم'' شاعر متخلص بہ نسیم کا جہاں باغ فکر اور گلزار فن ہے وہاں ''گلزار نسیم'' یعنی باغ نسیم، سری نگر کی بھی ایک معنوی جہت رکھتا ہے بلکہ نسیم نے جس باغوں اور بہاروں کے جس شہر کا نقشہ اس مثنوی میں کھینچا ہے وہ اپنے پہلے مصرع سے ہی فکر کو دوسرے نگر کی طرف موڑ دیتی ہے۔

''ایک باغ تھا نہر کے کنارے''

صرف ''گلزار نسیم'' پر ہی نہیں موقوف کشمیر اور کشمیر میں بسے ہوئے عروس البلاد سری نگر کی علامتی قدریں (SymbolicValues) تو دوسرے کلاسیکی شاہکاروں میں بھی موجود ہیں اردو کے عظیم ترین اور قابل فخر افسانوی کلاسک "باغ و بہار" میں تو کشمیر کا ذکر بڑے اہتمام و تفصیل سے موجود ہے، مقالہ نگار کو تو سری نگر اور کشمیر کا استعاراتی پرتو "سحر البیان" میں بھی نظر آتا ہے کہ جس میں اپنے شہر مثالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے نسیم لکھنو کے "ایک باغ تھا نہر کے کنارے" سے کافی قریب دکھائی دیتے ہیں اور جس کا نقشہ وہ کھینچتے ہیں وہ کشمیر کا کوئی شہر دکھائی دیتا ہے۔ جہاں پھول ہیں اور جہاں مرغزار ہیں نہریں اور جھیلیں ہیں۔ مثنویوں کی فضا رومانوی اور گل و بلبل کی حکایت سے پر ہوتی ہی ہے چنانچہ ان میں دانستہ یا نا دانستہ کسی نہ کسی "جنتِ ارضی" کو پینٹ کرنا ہی پڑتا ہے لیکن ہندوستان میں لکھی گئی شاعری کی کوئی صنف چاہے وہ مرثیہ ہی کیوں نہ ہو، جو اگر چہ اپنے مناظر و ماحول میں جزیرہ نمائے عرب کی صحرائی سرزمین کو پیش کرنے کا پابند ہے کشمیر کے ارضی حسن کے فسانہ وفسوں سے ماورا نہیں۔ انیس و دبیر کے مراثی میں جہاں کہیں بھی صحرا میں نخلستان کا ذکر آتا ہے، یوں لگتا ہے کہ بات صحرائے عرب اور عراق کی نہیں ہو رہی، سرزمین کشمیر کی ہو رہی ہے۔ خاص طور پر ان کی منظر نگاری پر تو ہر لحہ کشمیر کی تصویر کشی کا گمان گزرتا ہے:

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بہ دم　　　مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیا ں بہم

غالب نے اپنے غزل کے ایک شعر میں میر اور کشمیر دونوں کو وہ شاندار اور یادگار خراج تحسین پیش کیا ہے کہ ہر دو کو یادگار اور لازوال بنا دیا ہے، گلشن کشمیر کی نسبت سے میرؔ کو اور شعر میرؔ کے وساطت سے حسن کشمیر کو یہ ایک خراج تحسین ہے، جس سے میرؔ کی کشت شعر اور کشمیر کی کشت زعفران دونوں پر فخر کر سکتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں۔

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ　　　جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

غالبؔ کے ہم عصروں میں مومن خان مومن غزل گوئی کے حوالے سے اہم اور معتبر شاعر ہیں مومن کشمیری ہیں لیکن مومن کے ہاں کشمیر اور کشمیریت کا حوالہ نظر نہیں آتا، یہی صورت ذوق کی ہے حالاں کہ وہ قصیدے کے شاعر ہیں اور قصیدہ گوئی کی نوکِ قلم پر کشمیر کی حکایتِ شیریں نہ چاہتے ہوئے بھی آجاتی ہے اس کے برعکس قصیدے کے عظیم شاعر مرزا رفیع سودا کے ہاں قصیدے کی منظر نگاری میں چمنستان کشمیر کی ایک ہلکی سی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ سودا اپنے مشہور قصیدے ''اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل'' میں کشمیر کے توصیف میں لکھے گئے عرفی کے ایک مصرع کو بہ قرینہ تضمین اپنے شعر میں یوں باندھتے ہیں:

سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر　　　ساغر لعل میں جوں کچھ زمرد کو حل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی　　　''اخگر فیض ہوا سبز شود در مقتل''

نظیر اکبر آبادی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ رنگوں، آہنگوں اور ترنگوں کے شاعر ہیں۔ ان کا دیوان رنگوں، ذائقوں، تصویروں، منظروں اور میلوں جھمیلوں کا ایک ''ایوان'' ہے۔ ایسے منظر شناس اور منظر نگار کو پھولوں اور خوش بوؤں، رنگوں اور آہنگوں، موسموں اور رتوں سے آراستہ خطہ کشمیر دیکھنے کا موقع ملتا تو ان کی کشت شعر پر کتنے ہی رنگ اُتر آتے لیکن لگتا ہے اس شاعر کے قرطاس خیال پر بھی کشمیر کا عکس جمیل جھملا گیا ہے۔ انھوں نے جاگتی آنکھوں سے نہ سہی لیکن چشم تصور کے کرشمے سے کشمیر کو دیکھا ضرور ہے۔ ان کی شاعری جہاں اپنے عہد ۱۷۳۵ تا ۱۸۳۰ کے اعتبار سے، اپنے میڈیم (نظم) اپنے موضوعات، زمینی سچائیوں اور بے رحم حقیقت نگاری کے اعتبار سے ایک حیرت کدہ اور حیران کن تجربہ ہے۔ ان کا ایک نظم پارہ جس کا پہلا حصہ، جس باغ کی منظر کشی کرتا ہے وہ باغ باغ کشمیر جنت نظیر کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم کی لفظیات اور منظر نگاری، دونوں چیزوں میں وادیٔ کشمیر کے استعارے موجود ہیں اور اس میں "تازگی لالہ کے تن کی"، "سرو و شمشاد و صنوبر"، "کہیں انگور معلق''، ''روح بالیدہ ہو آئی''، ''شان قدرت دکھائی''، ''جان میں جان آئی''، ''باغ کیا تھا گویا اللہ نے اس باغ میں جنت کو اتارا'' جیسے استعارے کشمیر جنت نظیر کا کیسا واضح نقشہ کھینچتے ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو:

ایک دن باغ میں جا کر
چشم حیرت زدہ وا کر
جامہ صبر قبا کر
طائر ہوش اُڑا کر

شوق کو راہ نما کر
دیکھی رنگت جو چمن کی
خوبی نسرین و سمن کی
شکل غنچوں کے دہن کی
تازگی لالہ کے تن کی
ناز کی گل کے بدن کی ۲۰

کشمیر اقبال کا آبائی وطن ہی نہیں تھا اقبال کے فکر و عمل کا ایک بہت اہم حوالہ بھی تھا۔ شعور کی آنکھ کھلنے سے لے کر موت تک اقبال نے فکری اور عملی، دونوں سطحات سے کشمیر کو اپنی جدوجہد کا ایک مرکز و منبع بنا کر رکھا۔ خیابان کشمیر کے اس پھول نے، کشمیر کے اس برہمن زادے نے اپنا تعارف یوں کرایا:

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نہ می بینی　　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تیریزت

کشمیر اقبال کا پہلا عشق ہے اور آخر بھی۔ بقول ڈاکٹر صابر آفاقی: ''ہماری تحقیق یہ [ہے] کہ علامہ کو بیس سال کی عمر سے بھی پہلے کشمیر سے دل چسپی پیدا ہوئی اور یہ دلچسپی مرتے دم تک باقی رہی۔ انھوں نے ۱۸۹۶ء سے ۱۹۳۸ء تک پورے پنتالیس سال ملت کشمیر کے غم میں آنسو بہائے وہ تقریباً نصف صدی تک اپنی شاعری اور اہل کشمیر کی راہنمائی کرتے رہے''۔(۲۱)۔ فروری ۱۹۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری نے ''انجمن کشمیری مسلمانان'' قائم کی۔ علامہ اقبال ان دنوں بی اے کے طالب علم تھے۔ انجمن کے پہلے اجلاس میں اقبال نے ۱۲۷ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ سنایا۔ جس کا ایک شعر تھا:

ہزار شکر کراک انجمن ہوئی قائم　　　یقیں ہے راہ پر آئے گا طالع واژوں

کشمیری مسلمانوں کی فکری اور سیاسی قیادت کا یہ پہلا قدم بہت بابرکت ثابت ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں کشمیر پر قطعات لکھنے والا کشمیری الاصل اقبال ۱۹۳۰ء کے بعد ایک طرف جاوید نامہ میں سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کی زبان سے اپنی قوم کو پیغام بیداری دیتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف ''ارمغان حجاز'' میں ایک قطعی فرضی ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کی زبان سے سترہ ''نظمیں'' کہلوا کر اس خطہ مجبور و محکوم و اسیر کو بقول ڈاکٹر صابر آفاقی: ''صرف ارمغان حجاز میں کشمیر پر اقبال کا جتنا کلام ملتا ہے اتنا کلام آپ کو اقبال کے سارے کلام میں کسی ملک یا قوم کے حوالے سے نہیں ملے گا'' ۲۲

۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ تک اقبال انگلستان اور جرمنی میں رہے۔ یہ ان کے مطالعہ و تحقیق کا زمانہ تھا سو اپنے علمی استغراق کی بنا پر وہ اس عرصے میں کشمیر کے حوالے سے کوئی خاص نظم نہ لکھ سکے تاہم بانگِ درا میں

شامل ایک نظم ''خطابِ نوجوانانِ اسلام'' میں انھوں نے عظیم کشمیری شاعر ملا طاہر غنی کا ایک شعر شامل کیا:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن   کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا ۲۳

یورپ سے واپسی پر اقبال آل انڈیا کشمیر کانفرنس کے جنرل سیکریڑی منتخب ہوتے ہیں (عظیم کشمیری محقق منشی محمد دین فوق جنھیں اقبال نے ''مجدد کشامرہ'' کا خطاب دیا تھا، ان کے جوائنٹ سیکریڑی مقرر ہوئے کشمیر سے اقبال کی رغبت والہانہ ہے۔ وہ سارے ہندوستان میں کشمیری کمیونٹی کو اپنے شہروں میں مجلس کشمیر کے قیام کی تحریک کرتے ہیں۔ آپ محمد الدین فوق کے نام اپنے ۱۱ مئی ۱۹۰۹ کے محررہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ ''میں تحریک کرتا ہوں کہ آپ اپنے شہر میں ضرور کشمیری مجلس قائم کریں۔ اس کے علاوہ ایسے مقام میں، جہاں آپ کا اثر ہو اپنے دیگر کشمیری بھائیوں کو کشمیری مجلس قائم کرنے کی ترغیب بھی دیں'' (۲۴)۔ اقبال کو کشمیر کے لٹریچر اور تاریخ سے بھی رغبت رہی پنڈت کلھن کی ''راج ترنگنی'' سے لے کر فیلسوف کشمیر ملا محسن فانی کی ''دبستان مذاہب''، تک کے لیے اقبال کی دل چسپی اُن کی کشمیر شناسی کی خواہش کو ظاہر کرتی ہے۔ کشمیر کے لیے اقبال کی محبت ان کے سفر کشمیر سے اور دو چند ہوگئی اور سفر کشمیر کے بعد کی شاعری سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کو کشمیر کے حوالے سے اپنی شاعری کے لیے نئے مضامین اور نئے استعارے ہاتھ آئے۔ آپ جون ۱۹۲۱ کے پہلے عشرے میں براستہ کوہالہ، مظفر آباد، چکوٹھی اوڑی سری نگر گئے اور دو ہفتے کے قیام کے بعد جون ۱۹۲۱ کے آخری عشرے میں لاہور واپس آ گئے۔ اس سفر کے دوران اور اس کے بعد کشمیر کے حوالے سے اقبال کی شاعری میں ایک عجیب تاثیر پیدا ہوئی۔ کشمیر کے نظاروں کو دیکھ کر ایک طرف تو ان کے احساس جمال کو انگیخت ملی تو دوسری طرف کشمیر میں صدیوں کے افلاس اور غلامی میں جکڑے ہوئے ہم وطنوں کا حال زار دیکھ کر ان کے کلام میں درد و سوز کی لے اور زیادہ تیکھی ہوگئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ کشمیر کے حوالے سے اقبال کا موقر و متعدد بہ کلام فارسی میں ہے ''ساقی نامہ''، ''کشمیر''، ''غنی کاشمیری''، اور جاوید نامہ (سفر آسمانی) جیسی عظیم الشان اور دنیا کے لٹریچر میں زندہ جاوید نظمیں اپنے فارسی میڈیم کی وجہ سے (افسوس صد افسوس!!) کہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

''ارمغان حجاز'' میں ''ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' کے عنوان کے تحت اقبال نے سترہ نظمیں کہی ہیں۔ وادی کشمیر سری نگر اور بارہ مولہ کے درمیان واقع ''لولاب'' کا علاقہ بہت مشہور ہے ''ملا زادہ ضیغم'' فرضی نام ہے جس کے معنی ہیں ''ملا کا بیٹا شیر۔'' علامہ کو کشمیری علما و صوفیا سے گلہ یہ ہے کہ اب منبر و محراب صاحب ہنگامہ نہیں رہے اور اب وادی میں بندہ مومن کے لیے دین موت بن گیا ہے یا خواب! اور رہ گیا خانہ صوفی، سو اس کی شراب بے سوز ہوگئی ہے علامہ یقین رکھتے تھے کہ وادی کے انھیں علما و صوفیا میں دلیر و شجاع افراد پیدا ہوں گے جو کشمیر کی

آزادی اور اس کی ترقی کے لیے کام کریں گے بلکہ ایک ایسا ہی فرد علامہ نے تخلیق بھی کر لیا ہے جو ہے تو ملا زادہ
جرأت و شجاعت میں شیر ہے ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں ''ضیغم! اس ملا زادہ نے اپنی ایک بیاض بنا رکھی ہے
میں اپنی پسند کے اشعار نقل کر رکھے ہیں (۲۵)۔

سترہ نظموں کی اس ''بیاض'' میں اُناسی (۷۹) اشعار ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اس محبت
حق ادا کر دیا ہے جوان کو اس ''قومے نجیب چرب دست و تر دماغ'' کے ساتھ تھی اور جس محبت نے ان کی رو
کو شعلہ جوالہ بنا رکھا تھا ملا زادہ ضیغم لولابی کی بیاض میں درج کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہو اسیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

اے وادی لولاب ۲۶

اسی بیاض میں تین اشعار کی ایک دل چھو لینے والی نظم ہے:

موت ہے ایک سخت تر جس کا غلامی ہے نام — مکروفن خواجگی کاش سمجھتا غلام
شرح ملوکانہ میں جدت احکام دیکھ — صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام
اے کہ غلامی سے ہے روح تیری مضمحل — سینہ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا غلام ۲۷

تیسرے نمبر پر درج نظم کشمیری قوم کا نوحہ ہے اور اس میں ڈوگرہ استعمار کے مسلط کیے ہوئے استحصالی قوانین کی
مذمت کی گئی ہے:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور واسیر — کل جسے اہل نظر کہتے تھے ''ایرانِ صغیر''
آہ یہ قوم نجیب و چرب دست وتر دماغ — ہے کہاں روزِ مکافات؟ اے خدائے دیر گیر ۲۸

چوتھی نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو — تھرتھراتا ہے جہانِ چارسوے رنگ و بو
ضربت پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش — حاکمیت کا بت سنگیں دل و آئینہ رو ۲۹

اگلی نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دراج کی پرواز میں ہے شوکت شاہین — حیرت میں ہے صیاد یہ شاہین ہے کہ دراج ۳۰

کشمیر صوفیا و اولیاء کی سرزمین کہلاتا ہے۔ لیکن خرد سے تہی ملائیت کی طرح عمل سے بے گانہ تصوف
نے بھی کشمیر کے عوام کو ضعیف الاعتقادی کا عادی بنایا ہے ملا زادہ ضیغم لولابی کے ''بیاض'' میں اس حوالے سے
بھی ایک نظم ملتی ہے جس میں سالک محکوم اور سالک آزاد کا بڑا دلچسپ موازنہ پیش کیا گیا ہے:

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات　　　ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خودداری و گلبانگ انا الحق　　　آزاد ہو سالک تو یہ ہیں اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ ادست　　　خودمردہ و خود مرقد و خودمرگ مفاجات ۳۱

ڈوگرہ شاہی کے ذہنی غلامی کے عادی صوفیوں، سالکوں اور خانقاہوں کے مردہ ضمیر رہبانیت پرست اور بے عمل سجادہ نشینوں کو اقبال نے اس بیاض کی ساتویں نظم میں یوں دعوت عمل دی ہے:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری　　　کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری ۳۲

چنار کشمیر کا قومی درخت ہے اور چنار کی لکڑی کی آگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ اوپر اوپر سے بجھی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اندر سے دہک رہی ہوتی ہے چنار کے پیڑ کے اس معنوی استعارے سے اقبال نے کیا خوب صورت مضمون پیدا کیا ہے:

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار　　　ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ار جمند ۳۳

اقبال کشمیر کی آزادی کے لیے علماء صوفیا کی بیداری فکر کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے لیے مطالعہ کتابی کی بجائے مطالعہ فطرت کو داد دیتے ہیں۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

کھلا جب چمن میں کتب خانہ گل　　　نہ کام آیا ملا کو علم کتابی
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں　　　غزل خواں ہوا پیرک اندرابی ۳۴

اقبال نے اپنے فلسفہ آزادی و محکومی کے بہت سے مضامین اپنے وطن خوابوں کی جنت یعنی کشمیر جنت نظیر سے اخذ کیے ہیں۔ غلامی و آزادی کا موازنہ انھوں نے اسی ملازادہ ضیغم لولابی کے بیاض میں پیش کیا ہے:

آزادی کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ　　　محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش　　　وہ بندہ افلاک ہے یہ خواجہ افلاک ۳۵

سیاسیات کشمیر کا ایک المیہ یہ بھی رہا ہے کہ یہاں مذہبی قیادت نے مذہب کے نام پر کشمیریوں کا استحصال کیا ہے چنانچہ کشمیری سیاسی جدوجہد میں بھی ایک میر واعظ خاندان مالک بست وکشاد بنا رہا ہے شیخ عبداللہ نے اپنی کتاب ''آتش چنار'' میں اس گھرانے کی سیاسی شطرنج بازیوں کو اقبال ہی کے الفاظ میں ''بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں'' کے عنوان کے تحت رقم کیا ہے۔ یہ خاندان کشمیر کی عملی سیاست میں تو بڑی دیر میں دخیل ہوا لیکن اقبال کی نگاہ پردہ سوز نے بہت پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ کشمیر کی شعور تازہ سے محروم طرز کہن پر اڑنے اور آئین نو سے ڈرنے والی یہ مذہبی قیادت کشمیری عوام کی نگاہوں سے باطنِ ایام میں سرگرم ہنگامہ انقلابی روح کو چھپا لے گی۔ نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک　　　　گہر ہیں آب وُلر کے تمام یکدانہ

اقبال کی پہلی نظم ہی ''ہمالہ'' تھی اور ان کی شاعری کا ایک بڑا وقیع استعارہ بھی ہمالہ تھی! اقبال ہمالہ کشمیر کے وقار اور کشمیریوں کی استقامت کا زندہ حوالہ سمجھتے تھے ارمغان حجاز کی اس نظم کی تان ہمالہ کے چشمے پہ جا کر ٹوٹتی ہے:

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک　　　　خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے ۳۷

ملازادہ ضیغم لولابی کے بیاض میں عید کو ایک عمومی استعارہ بنا کر اقبال نے زندہ قوموں کے صبح ومسا کا ایک نسخہ پیش کیا ہے۔ جس کا ہر دن ایک خاص ایک منفرد اور زندگی کی روا روی سے بھرپور دن ہے نہ کہ صرف عید بقر عید پر اتنا کچھ صرف کر دیا جائے کہ تمام سال افلاس و بے چارگی میں گزارنا پڑ جائے:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا　　　　کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن　　　　قبول حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں ۳۸

اس سلسلے کی پندرھویں نظم بلا کا درد و سوز رکھتی ہے۔ اس نظم میں دنیا کا کشمیر جیسے کمزور اور محکوم قوموں کے ساتھ سلوک اس درد انگیز قرینے سے بیان کیا ہے کہ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس نظم میں کشمیر کے چرب دست محنت کشوں بالخصوص شالا بافوں کی بدنصیبی کا نوحہ بیان کیا گیا ہے:

سرما کی ہواؤں میں ہے عُریاں بدن اس کا　　　　دیتا ہے ہُنر جس کا امیروں کو دوشالہ ۳۹

اس سلسلے کی آخری (انیسویں) نظم میں اقبال اپنے ہم وطنوں سے بڑے درد کے ساتھ مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر چہ میں اس جنت سے نکالا ہوا اور اپنے ہی اس وطن مالوف میں غریب الدیار ہوں لیکن میری بات کو غور سے سن تو لو کیوں کہ میری باتیں تمھیں غلامی سے نجات دلوائیں گی! ورنہ میری محنت اکارت جائے گی کیوں کہ میری محنت فرہاد کی محنت سے بھی زیادہ درد آموز اور مشقت آمیز ہے فرہاد تو اپنا تیشہ پتھر کی سلوں پر مارتا تھا لیکن میں تو اپنے وطن اور اپنے ہم وطنوں کے غم واندوہ میں اپنے جگر پر ضرب لگا رہا ہوں:

گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کو رذوقی سے　　　　سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ بر سنگ میخورد گر است　　　　خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ بر جگر است ۴۰

کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی شاعری میں اقبال کے بعد جس شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے وہ حفیظ جالندھری ہیں۔ حفیظ نے کشمیر کے حوالے سے جو شاعری کی ہے مقدار اور معیار دونوں اعتبارات سے وقیع اور قابل لحاظ ہے۔ یوں تو ان کی نظموں میں ''کشمیر کے جاں باز'' ''فردوس بر روئے زمین'' اور ''آزاد کشمیر کا قومی ترانہ'' بھی ان کے لازوال شاہکار ہیں لیکن کشمیر کے حوالے سے حفیظ کی نظموں کا ماسٹر پیس ''ان کا مسدس'' ''تصویر کشمیر''

ہے جو کتابی صورت میں شاہکار ہوچکی ہے انچاس بندوں کی یہ نظم ۱۹۳۶ میں سری نگر کے اولین نمائشی مشاعرے میں لکھی گئی۔ جیسا کہ کتاب ''تصویر کشمیر'' کے ''عرض حال'' میں حفیظ نے لکھا ہے۔ ۲۵ گھنٹوں میں لکھی گئی یہ نظم ایک مصرعہ طرح ''زرہ زرہ جہاں فزا ہے گلشن کشمیر کا'' پر لکھی گئی۔ بقول حفیظ ''غزل کہہ کر غالب کا منہ چڑانے کی جرأت نہ تھی مدتوں کشمیر کے مختلف اور متضاد مناظر میری روح میں بسے ہوئے تھے۔ مدیر ہمدرد (پنڈت پریم ناتھ) اور شیر کشمیر (شیخ محمد عبداللہ) کی دیرینہ فرمائش بھی تھی لہٰذا قافیے کی رعایت سے کشمیر پر کچھ کہنے کا تہیہ کرلیا۔[۴۱]

''تصویر کشمیر'' غالباً شاہنامہ اسلام کے بعد حفیظ کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ہے جسے اگر ''شاہنامہ کشمیر'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا سر راس مسعود اس کتاب کے دیباچے ''تقریب'' میں لکھتے ہیں۔ ''مجھے امید ہے کہ حفیظ کا کھینچا ہوا یہ مرقع ہندوستان کے ہر سچے فرزند کے خانہ دل کو تصویر خانہ بنا دے گا۔ کیوں کہ نہ تو اس میں کوئی سیاسی تبلیغ ہے نہ وعظ نہ پند و نصائح![۴۲] سر راس مسعود کی بات جزوی طور پر درست ہے۔ اس میں وعظ و پند و نصائح ''تو فی الواقع نہیں ہیں۔ لیکن سیاسی تبلیغ نہ ہونے کے باوجود بھی یہ نظم سیاسی مضامین سے خالی نہیں ہے۔ اس میں ریاست کے سیاسی حالات کا رنگ خاصا گہرا ہے اور اس نظم کو پڑھ کر ریاست جموں و کشمیر کے اس عہد کے سیاسی منظر نامے کا نقشہ کھنچ کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ نظم دراصل ایک قسم کی ''البم'' ہے۔ اس البم میں کشمیر کے حوالے سے انچاس تصویریں ہیں۔ شروع میں زیادہ تر کشمیر کے حسن کے مناظر ہی ہیں۔ مثلاً:

نقش حیرت ہوں مجھے یارا نہیں تقریر کا — ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا [۴۳]

یا---

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنت نشاں — ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت؟ چند حوریں، اک چمن، دو ندیاں؟ — خیر، زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں! [۴۴]

یا---

نیم باز آنکھیں، مگر ہر سو نشانہ تیر کا — ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر [۴۵]

لیکن نصف ''البم'' کے بعد خیالات کی تصویر کشی پلٹا کھاتی ہے اور طنز کے ایک خفیف لیکن صاف طور پر محسوس ہونے والے رنگوں میں خوش منظر کشمیر کے بدنصیب اور صدیوں سے غلامی کی زنجیر میں جکڑے مفلوک الحال، افلاس زدہ اور استعمار و استحصال کا شکار کشمیریوں کی خوں چکاں تصویریں دل کو لہو کر دیتی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ زمین پر جنت کے مکیں غلامی اور محرومی اور افلاس اور استبداد کے ہاتھوں جہنم سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں جن کے درد غلامی اور غم افلاس سے کسی کو کوئی دل چسپی نہیں کیوں کہ لوگ تو یہاں کشمیر کا حسن

دیکھنے کے لیے آتے ہیں، کشمیریوں کے زخم شمار کرنے نہیں! سو کشمیر اگر ''جنت ارضی'' ہے تو صرف اس کے سیاحوں کے لیے، اس کے حسن کے نظر بازوں کے لیے۔ خود کشمیریوں کے لیے تو یہ جنت جہنم سے زیادہ خطۂ اذیت ہے:

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لیے   یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لیے ۴۶

یا۔۔۔

جس کی محنت سے چمن میں روئے گُل پر خندہ ہے   اس کا گھر تاریک، اس کا اپنا منظر گندہ ہے ۴۷

اور۔۔۔

ایک تماشائی ہے، اک فرزند ہے کشمیر کا   ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا ۴۸

غضب یہ ہے کہ اس المیے کی طرف دیکھنے والا بھی کوئی نہیں۔ کسی کو غرض ہی کیا۔ لوگ تو کشمیر کے زعفران زاروں وادیوں اور کوہساروں، چناروں اور سبزہ زاروں جھیلوں اور باغوں کو دیکھنے آتے ہیں۔ وہ افلاس زدہ کشمیریوں کی طرف دیکھ کر اپنا لطف خراب نہیں کرنا چاہتے۔ بقول حفیظ:

خیر! ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے   بدگماں ہوتی ہے دنیا اک ذرا سی بات سے
ہم تو لطف اندوز ہونے آئے ہیں باغات سے   ہم کو دلچسپی نہیں ہے مالیوں کی ذات سے ۴۹

اور۔۔۔

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں؟   کم سخن کم زور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں؟
حسن و صنعت کے لیے مشہور ہیں ہم کیا کریں؟   ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں، ہم کیا کریں؟ ۵۰

ایک انداز یہ بھی ہے کہ:

آؤ ویری ناگ دیکھیں آؤ اچھا بل چلیں   ہستی مزدور کو پیروں کے نیچے مل چلیں
اس کی یہ مسکین صورت دام ہے تزویر کا   ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا ۵۱

اور اس سے بہتر انداز کیا ہو سکتا ہے کہ:

یہ نتیجہ ہے کس ناگفتنی تقصیر کا   ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا ۵۲

حفیظ نے اس عہد کے ڈوگرہ استبداد کے ستائے ہوئے کشمیر کی تصویر کشی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، نہ کسی رعایت سے کام لیا نہ رغبت سے، نہ مصلحت دکھائی حفیظ کے اندر کے انقلابی شاعر نے، باوجود اس کے کہ وہ بار بار کشمیر جاتے تھے اور وہاں مہاراجہ ہری سنگھ کے جیسا سفاک اور سخت گیر شخص حکمرانی کا وارث آمر مسند اقتدار پر براجماں تھا جس سے حفیظ کی مڈبھیڑ بھی ہو جاتی تھی، ان بے توفیق اور مغرب کے گماشتہ حکمرانوں کو طنز کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی:

حاکم و محکوم کا کوئی نہیں ہے امتیاز   سب نگاہ ناز مغرب پر ہیں مجبور نیاز
یہ برہمن کے بھجن، یہ شیخ صاحب کی نماز   کر رہے ہیں قید نا محسوس کی رسی دراز ۵۳؎

اور۔۔۔آخری

کیا بنا سکتی ہے پھر اے دوست تیری ہائے ہائے   یہ مناظر دیکھتا جا اور نہ کر اظہار رائے
ورنہ فتویٰ ایک دن لگ جائے گا تکفیر کا   ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس نظم کے نفس مضمون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی اردو نظموں میں سب سے پر اثر، کشمیر کی سچی تصویر کشی کا ایک خوب صورت مرقع، اس کے حسن اور اس کے مکینوں کے یہاں ڈوگرہ استبداد کی چیرہ دستیوں کی بھرپور منظر نگاری کی امین اور حفیظ کے جوش بیان کا منہ بولتا ثبوت ہے یہ نظم کشمیر کے حوالے سے لکھے گئے لٹریچر میں ایک زندہ جاوید نقش ہے جو اپنے حسن اور اپنی بھرپور اپیل کی بنا پر دیر تک اور دور تک یاد رہے گا۔ کشمیر کے حسن کی مرقع نگاری حفیظ کی ایک اور نظم ''فردوس برروئے زمیں'' میں بھی جلوہ آرا ہوتی ہے۔ اس نظم کے کچھ بند ذیل میں درج ہیں:

یہ بہشت بریں زمیں پر ہے   آسماں پر نہیں، زمیں پر ہے
ہاں یہیں، ہاں یہیں زمیں پر ہے   امن کی یہ زمیں، زمیں پر ہے
ہر جگہ، ہر کہیں زمیں پر ہے   دل میں ہے دل نشیں زمیں پر ہے
برزخ آب وگل ہے یہ وادی   میرا اپنا ہی دل ہے یہ وادی ۵۵؎

اس نظم کے تیور بہت تیکھے ہیں۔ لہجہ میں بلا کی کاٹ اور معانی میں بے پناہ آتش ناکی ہے۔ یہ کشمیر میں ڈوگرہ استبداد اور شخصی آمریت کی قہرمانیوں کی سچی تصویر ہے جس کی بنا پر اس جنت ارضی سے جان بچا کر نکل آنے والے سجدہ شکر ادا کرتے ہیں اور جنت میں لگی اس آتش نمرود کی بنا پر اس کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی خواہش بھی نہیں کرتے۔ کشمیر کے حوالے سے حفیظ کے یہی تلخ تجربات تھے، جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ڈوگرہ استبداد کے خلاف کشمیریوں نے علم جہاد بلند کیا تو انقلاب پسند اور ظلم سے نفرت کرنے والے حفیظ نے اس بغاوت کو دل و جاں کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہا، ان کی نظم ''کشمیر کے جاں باز'' اسی جذبے کا تخلیقی اور فکری اظہار ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ دیکھو! وادی کشمیر کے جاں باز جاتے ہیں   ستارے اپنی آنکھیں جن کی راہوں میں بچھاتے ہیں
یہی وہ ہیں کہ جو ایماں کی خاطر جاں دے دے کر   عدد کے آہنی پنجوں سے ہم سب کو بچاتے ہیں
خداوند! تیری محبوب کی امت پہ حملہ ہے   تری نصرت سے یہ غازی مجاہد فتح پاتے ہیں ۵۶؎

حفیظ کشمیر کے معاملے میں صرف شاعر ہی نہ تھے انھوں نے کشمیر کے مناظر، ان کا جز ولاینفک بن کر دیکھے انھیں اپنی روح میں بسایا۔ اپنے شعور ولاشعور کا حصہ بنایا! انھوں نے کشمیریوں کے دکھوں کو اپنے دل میں دھڑکتی ہوئی حقیقت کی طرح محسوس کیا۔ انھوں نے جہادِ کشمیر کو تماشائی بن کر نہیں، بلکہ تماشا بن کر دیکھا آزادی کشمیر کے ترانے ''ترانہ آزاد کشمیر'' کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں: ''قائداعظم کے حکم سے حفیظ ۲۲/نومبر ۱۹۴۷ محاذِ محاربہ آزادی کشمیر پر تھا۔ یہ ترانہ فضا میں گونج رہا تھا۔'' ۵۷۔ ترانے کے بول شروع میں یوں تھے:

''باغوں اور بہاروں والا
دریاؤں کو ہساروں والا
آسمان ہے جس کا پرچم
پرچم چاند ستاروں والا
جنت کے نظاروں والا
جموں اور کشمیر ہمارا
وطن ہمارا آزاد کشمیر ۵۸

بعدازاں اس ترانے میں جابجا ترامیم ہوتی رہی ہیں۔ کچھ حفیظ کی زندگی میں کچھ ان کے بعد۔ بلکہ آج تک ہو رہی ہیں۔ چنانچہ آج، صبح وشام جو ترانہ گونجتا ہے اس سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔ کشمیر کے حوالے سے حفیظ کی شاعری کا یہ مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ رومانویت پرست اور غنائیت پسند حفیظ جالندھری کشمیر پر قلم اٹھاتے ہیں تو ایک انقلاب پسند بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کے قلم میں طبقاتی کشمکش کا سارا کرائسس در آتا ہے۔ وہ ایک سچے انقلابی اور پکے پرولتاری کی طرح، استحصال، استبداد، انارکی، آمریت، شخصی اور موروثی نظامِ حکومت، جاگیرداری، جبر، سرمایہ داری اور عدم مساوات کو للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ آزادی پسندوں کے ہم نوا، ہم آواز بن کر نعرہ انقلاب بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے شعر کہتے ہوئے ''شاعرِ اسلام'' شاعرِ کشمیر شاعرِ آزادی اور شاعرِ مزاحمت بن کر سامنے آتا ہے۔ جہادِ کشمیر کے حوالے سے کی گئی شاعری میں حفیظ کے بعد پروفیسر امین طارق قاسمی کا نام آتا ہے۔ امین طارق قاسمی نے حفیظ کے شاہنامہ اسلام کی بحر (بحر ہزج مثمن سالم) مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن میں ''جہادِ کشمیر'' کے عنوان سے شاہنامہ کشمیر لکھا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا سارا نظام اور اس کی ترتیب حفیظ کے ''شاہنامہ'' والی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب حفیظ کے شاہنامے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ ۳۲۲ صفحات کی اس منظوم

تاریخ میں ''سلطنت مغلیہ کا زوال'' سے لے کر ''حق و باطل کی آویزش'' تک ۷۲ عنوانات کے تحت منظوم قلم فرسائی کی گئی ہے اور ان عنوانات سے پہلے روایتی شاہ ناموں کی طرح ''حمد''، ''نعت''، ''ساقی نامہ''، ''عرض حال''، ''سنگ راہ''، ''مناجات''، ''پس منظر''، ''گذارش شاعر''، اور وادی کشمیر' جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ پیش لفظ اس وقت کے وزیر دفاع اور بعد کے صدر آزاد کشمیر کرنل سید علی احمد شاہ نے لکھا۔ لکھتے ہیں۔ ''مجموعی طور پر یہ تصنیف اس موضوع پر ایک مکمل اور جامع کتاب ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جہاد کشمیر کے لیے لکھی گئی شاعری کے ذخیرے میں ایک مفید اضافہ ثابت ہوگی اور تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کے فکر و شعور کی توسیع اور ان کے جذبات عمل کی ترقی کا ذریعہ بنے گی۔ ۵۹

کتاب کے موضوعاتی پھیلاؤ کے احاطے کے لیے اس کے عنوانات کے اشاریے پر ایک نظر ڈالنا نا مناسب ہوگا۔ درج ذیل عنوانات کے تحت نظمیں لکھی گئی ہیں۔ سر آغاز۔ حمد۔ نعت۔ ساقی نامہ۔ عرضِ حال۔ سنگِ راہ۔ مناجات۔ پس منظر۔ گذارش۔ وادی کشمیر۔ انقلابات عالم اور ہند۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال۔ پنجاب پر سکھوں کا قبضہ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ ڈوگرہ خاندان۔ جموں کی محتاجی۔ جاگیر اور خطاب و دیگر نوازشات۔ شمالی ہند پر انگریزوں کا تسلط۔ گلاب سنگھ کو جموں و کشمیر کا ملنا۔ مہاراجہ کا خطاب۔ کشمیر کا سودا۔ ڈوگرہ شاہی مظالم۔ بیع نامہ کے بعد۔ بے گار۔ ذوقِ شکار۔ ذبیح گاؤ کی ممانعت۔ عام چیرہ دستیاں۔ چند اور مسلمانوں کی ہجرت۔ مسلمانوں کی بیداری۔ مسلم کانفرنس کا قیام۔ اولین تحریک حریت۔ توہین قرآن۔ شیخ عبداللہ کی علیحدگی۔ ریاست پونچھ۔ خونِ ناحق۔ کشمیر چھوڑ دو۔ معذرت۔ دورِ نو۔ آزادی ہند۔ ہری سنگھ کا ہندوستان سے خفیہ گٹھ جوڑ۔ ہندوستانی غنڈوں کا داخلہ۔ مشقِ ستم۔ تکمیل جفا۔ ہری سنگھ کا دورہ۔ پونچھ سے آغاز کا سبب۔ ڈوگرہ فوج۔ تعین۔ ظاہری بہانہ۔ مسلمانوں سے اسلحہ کی ضبطی۔ نوجوانوں کی پیش دستی۔ دیہات کا منظر۔ مسلمانوں کا احتجاج۔ حکومت کی بے اعتنائی۔ پاکستان سے الحاق کا مطالبہ۔ دوستی کا پہلا ثبوت۔ تنگ آمد آغازِ جہاد۔ اسلحے کی فراہمی۔ مجاہدین کی ترتیب۔ تھانہ دھیر کوٹ پر حملہ۔ آزاد کشمیر کا قیام۔ آزاد قبائل کی کشمیر پر یلغار۔ گلگت کی بغاوت۔ صوبہ جموں کا قتل عام۔ ہری سنگھ قاتلانہ روپ میں۔ شیخ عبداللہ کی رہائی اور وزارت۔ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق۔ ہندوستان کی غیر آئینی مداخلت۔ حق و باطل کی آویزش۔ ترانہ کشمیر۔ عنوانات کے اس پھیلاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف جہاد کشمیر تک محدود نہیں اس میں کشمیر کی سیاسی تاریخ اپنے تفصیلی پس منظر و پیش منظر سمیت موجود ہے اور واقعات کو تاریخی اور سیاسی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جب واقعات کو ٹھوس عمرانی اور تاریخی و سیاسی تسلسل سے بیان کیا جاتا ہے اور بالخصوص قدرے قریب کے زمانے کی تاریخ کو تو اس کے جذیات اور تفصیلات کو تحقیق کے معروف اصولوں اور ضابطوں کے اندر رہ کر بیان

کیا جاتا ہے اس لیے شعریت کا مجروح ہونا لازمی ہوتا ہے۔ شعر تاریخ، تحقیق، واقعات کے تسلسل اور تاریخ کی واقعہ نگاری کی قید و بند میں گھٹ کر دب جاتا ہے۔ ان جکڑ بندیوں میں شاعری محض واقعات کی منظومیت رہ جاتی ہے۔ یہ صورت حال اس منظوم تاریخ میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب خالص مذہبی فکر کے زیر اثر لکھی گئی۔ اس کی وجہ بھی شاید یہ تھی کہ اس کے لکھتے وقت حفیظ کے ''شاہنامہ اسلام'' کو پیش نظر رکھا گیا لیکن یہ نہیں سوچا گیا کہ یہ شاہنامہ اسلام نہیں شاہنامہ کشمیر ہے۔ کشمیر کی آزادی میں مسلمانوں کی کاوشیں بہ منزلہ زیادہ ہیں اور اہل کشمیر کے پاکستان کے ساتھ رشتے بھی بہت زیادہ ہیں لیکن کشمیریت ہندو، مسلم، سکھ اور بدھ تین بڑے مذاہب کے ماننے والوں کی سرزمین ہے جو صدیوں سے آپس میں نہایت محبت اور اخوت سے رہتے چلے آئے ہیں۔

کشمیری مسلمانوں نے ڈوگرہ سامراجیت کے خلاف جہاد ضرور کیا لیکن اس لیے نہیں کہ ڈوگرہ ہندو تھے بلکہ اس لیے اور محض اس لیے کہ ڈوگرہ حکمران غاصب تھے، آمر تھے اور شخصی آمریت پر مبنی موروثی حکومت بڑی سفاکیت کے ساتھ چلا رہے تھے۔ جس میں کشمیریوں، بالخصوص مسلمانوں کے بنیادی انسانی اور شہری حقوق غصب کر لیے گئے تھے۔ اس طرح کے ظالمانہ اقدامات کسی مسلمان آمر اور غاصب حکمران نے بھی روا رکھے ہوئے ہوتے تو اس کے خلاف بھی اسی طرح جہاد کیا گیا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے شاعر اور چھوٹے شاعر میں فرق Vision کا ہوتا ہے۔ حفیظ شاعر اسلام تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے کشمیر کے حوالے سے جو کچھ لکھا اس میں ایک مصرعے سے بھی مذہبی عصبیت کی بو نظر نہیں آتی۔ حفیظ کشمیر میں رہے اور پھرے، وہ اچھی طرح جانتے کہ کشمیر میں تنگ نظری کہیں کسی ایک گلی کوچے میں بھی موجود نہیں۔ مذہبی منافرت اور عقیدے کے اختلاف کی بنا پر دست و گریباں ہونا کشمیر کے عظیم لوگوں کا مزاج نہیں۔ مذہبی رواداری کشمیریوں کے خون میں شامل ہے اور یہ انھیں نسلاً بعد نسلاً ایک مقدس ورثے کے طرح وراثت میں ملی ہے حفیظ اپنی کتاب کا انتساب یوں کرتے ہیں۔ ''بنام جذبہ اتحاد شیخ و برہمن'' ۶۰۔ جب کہ قاسمی صاحب اپنی اس منظوم واقعہ نگاری کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

غرض ٹکرائے گئے کیوں کفر اور اسلام آپس میں — یہ ذی اخلاص وہ اہل نمود و نام آپس میں
خیال آیا کہ میں اس دور کے حالات لکھ جاؤں — جفا کاروں کے ظلم و جور کے حالات لکھ جاؤں ۶۱

قاسمی صاحب جہاں کہیں ''کفر اور اسلام'' کی مذہبی عصبیت کے احساس سے باہر آتے ہیں وہاں ان کی شعری جوہر بھی سامنے آتے ہیں اور وہ خالص تخلیقی قدروں کے مطابق شعریت کی خوشبو بھی بکھیرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''وادی کشمیر'' کے تحت قائم کردہ عنوان میں کشمیر کے حسن کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

زمرد پانی پانی ہے جو سبزہ لہلہاتا ہے — حواس اڑتے ہیں جب کوئی پرندہ چہچاتا ہے

اچھلتے پھرتے ہیں چاروں طرف شفاف فوارے   یہ قطرے ہیں کہ گردوں سے گرے ہیں ٹوٹ کرتارے
فضا میں گونجتے رہتے ہیں نغمے آبشاروں پر   دل شاعر مچل جاتا ہے ان رنگین نظاروں پر ۶۲

لیکن رنگین نظاروں پر مچل جانے والا یہ ''دل شاعر'' ایک مذہبی جنونی کا رنگ دھار لیتا ہے اور انھیں رنگین نظاروں کو زیراور زیر تہس نہس کردینے کی صلائے عام دیتا ہے:

جہان کفر کی ہر خشت کو زیر وزبر کر دو   تمھارا منتظر ہے لال قلعہ اے جواں مردو
ابھی اسلام کے پرچم کو عالم گیر کرنا ہے   خدا کے فضل سے سارا جہاں تسخیر کرنا ہے ۶۳

ملاحظہ ہو ''جذبہ جہاد'' کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور قومی آزادی کی جنگ میں جذبوں کے عدم توازن کا منظر کہ شاعر ''مجاہدین اسلام'' کو نہ صرف اپنے ہی ملک کے قلعے اور باغ وراغ نیست و نابود کرنے اور اپنے وطن کے تاریخی ورثے کے نشانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی شہ دیتا ہے بلکہ دوسرے ملک کے مستقر ریاست پر چڑھ دوڑنے کا مشورہ بھی دیتا ہے اور جذبہ منہ زور پھر بھی ٹھنڈا نہیں پڑتا تو پوری دنیا کو ''تسخیر'' کردینے تک آجاتا ہے۔ سکھوں کا ذکر کرتے ہوئے ''پنجاب پر سکھوں کا قبضہ'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

ہوا مائل بہ پستی اختر اقبال سکھوں کا   کیا پنجاب سے مغلوں نے استحصال سکھوں کا ۶۴

رسوائے زمانہ ''بیع نامہ امرتسر'' کا ذکر ''کشمیر کا سودا'' کے عنوان سے کرتے ہوئے قاسمی صاحب کا قلم غیرت ملی سے شرربار ہوجاتا ہے:

پچھتر لاکھ ہے چالیس لاکھ انسان کی قیمت   یہ طے پائی بہم کشمیر کے دہقان کی قسمت
پچھتر لاکھ میں آخر ہوا کشمیر کا سودا   غریب و مفلس و خودار کی تقدیر کا سودا
پچھتر لاکھ میں بیچی گئی کشمیر کی وادی   یہ کیا کوئی طویلہ تھا کہ انسانوں کی آبادی ۶۵

کشمیریوں (بالخصوص مسلمانوں) سے بے گار (جبری اور بلا معاضہ مشقت) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

زیادہ وزن، خالی پیٹ رستے پرخطر سارے   سرمنزل پہنچتے کس طرح سے ظلم کے مارے
عذاب نزع ان پر تھا نہ جیتے تھے نہ مرتے تھے   بہت سے راستے میں جاں بہ حق تسلیم کرتے تھے ۶۶

اس کے برعکس ریاست پونچھ کے حکمرانوں کی بہت تعریف کی ہے۔ ریاست پونچھ کے پہلے راجا موتی سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیا اس نے ارادہ پونچھ کو آباد کرنے کا   رعایا کے حقوق زندگی آزاد کرنے کا ۶۷

دوسرے راجا پونچھ بلدیو سنگھ ڈوگرہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

رعایا کی سہولت اور اپنے کام کی خاطر　　بنا یا محکمہ اس نے فلاح عام کی خاطر ۶۸

تیسرے فرماں روائے پونچھ سکھدیو سنگھ کے بارے میں کہتے ہیں:

مقدر نے کیا جگد یو سنگھ کو جانشین اس کا　　جوانی میں گیا دنیا سے جسم نازنین اس کا ۶۹

یہ امر نا قابل فہم ہے کہ ایک ہی خاندان کے حکمرانوں میں ریاست پونچھ کے فرماں روا اس قدر نرم خو، عوام دوست، نیک دل اور عدل گستر اور جموں و کشمیر کے مہاراجے اس قدر سنگ دل، ظالم، جفا جو اور کینہ پرور کیوں تھے۔ لگتا ہے کہ دھیان سنگھ کی اولاد میں اس نیک دل اور وفا شعار راجا کا مزاج لگ گیا تھا جب کہ اس کے بھائی گلاب سنگھ کی اولاد میں گلاب سنگھ ہی کی شقاوت، جبروت اور جفا جوئی منتقل ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ نانک شاہی میں کشمیر کا سودا کیا تھا چنانچہ ہر ممکن طریقے سے عوام کا خون چوس کر سودے کے لیے خرچ ہونے والی رقم کا منافع کمانا چاہتے تھے۔ امین طارق قاسمی نے ''جہاد کشمیر'' میں کشمیر کی منظر نگاری اور اس کے تاریخی و سماجی منظر کی بجائے کشمیر میں تحریک جہاد کو فوکس کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ''معذرت'' کے عنوان کے تحت اس کا جواب ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

دکھانا ہے جہاں کو عارض گل رنگ آزادی　　حقیقت میں مرا موضوع ہے یہ جنگ آزادی ۷۰

جناب امین طارق قاسمی کے اس ''شاھنامہ کشمیر'' کے مطالعہ سے ان کے رنگ کلام کا اندازہ ہوتا ہے حفیظ کے شاہنامہ اسلام کی بحر، اس کے رنگ اور اس کے تتبع میں لکھی گئی یہ نظم جہاں کشمیر کی تحریک آزادی کی منظوم منظر نگاری کرتی ہے، وہاں اس میں شعریت اور تخلیقیت کے عناصر مفقود ہیں یہ اس وقت کے ایک تعلیم یافتہ لیکن پرجوش نوجوان کے جذبات و احساسات کا مجموعہ ہے سو اس میں جذباتیت اور انقلابی رومانیت کا غلبہ ہے جس کی بنا پر کہیں کہیں جذباتی توازن بھی بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں مذہبی عصبیت کا ایک رنگ بھی موجود ہے ٹھوس تاریخی حالات اور تحقیقی طور پر درست واقعہ نگاری پر مبنی ہونے کی بنا پر اس میں شعریت کی کمی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ ایک خاص دائرہ میں رہ کر تخلیق ہونے کے باعث اس کو کئی جکڑ بندیوں کا سامنا تھا لیکن اس کے باوجود زبان و بیان کی کئی خوبیوں سے مزیں اس منظوم رزمیہ داستان میں کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی شاعری میں بار پانے اور اپنی بھرپور انقلابی اپیل کی وجہ سے زندہ رہنے کے کچھ امکانات موجود ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے منظوم رزمیہ نگاری کی ایک اور کاوش بھی اردو ادب میں موجود ہے۔ یہ خان کفایت اللہ خان جلیس کی کتاب ''فغان کشمیر'' ہے خان صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ انھوں نے اس کتاب سے پہلے ''مرچنٹ آف تہراں'' کے نام سے ایک انگریزی کتاب بھی طبع کی تھی ''فغان کشمیر'' پر مبنی اس منظوم

تصنیف کے ٹائٹل پر کتاب کے نام کے ساتھ ''اردو نظم میں ریاست کشمیر کے قدیمی حالات، مخالفین کی تحریکات، گذشتہ سانحات حال کے واقعات، موجودہ مشکلات وآہندہ ضروریات'' کی توجیہی عبارت بھی درج ہے جس سے کتاب کے نفس مضمون کا اندازہ ٹائٹل دیکھنے سے ہی ہو جاتا ہے کتاب کے آغاز میں سردار محمد ابراہیم خان سابق صدر آزاد کشمیر، چودھری غلام عباس (سابق صدر آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس و سپریم ہیڈ حکومت آزاد کشمیر) مولوی محمد یوسف شاہ (سابق صدر آزاد کشمیر) کی تقریظات اور پروفیسر محمد اعظم صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات گارڈن کالج راولپنڈی کا پیش لفظ اور ۱۷ صفحے کا مصنف کا اپنا لکھا ہوا دیباچہ بھی ہے۔ سردار ابراہیم خان لکھتے ہیں: ''میں نے شروع سے آخر تک اس کتاب کو نہایت دل چسپی سے پڑھا ہے اور امید کرتا ہوں کہ اس کو ملک پاکستان وکشمیر میں خاصی شہرت حاصل ہوگی''۔ ۱ے

چودھری غلام عباس لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اس ریاست کے متعلق کتابوں میں اضافہ ہے، اس اعتبار سے مزید دل چسپی اور توجہ کی موجب ہے اس کے علاوہ اس کتاب کا ایک اچھوتا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ شروع سے ختم تک کل منظوم ہے اور اس اعتبار سے مزید دل چسپی اور توجہ کی موجب ہے''۔ ۲ے میر واعظ مولوی یوسف شاہ لکھتے ہیں: ''فغان کشمیر'' تنازعہ کشمیر پر ایک نہایت دل چسپ کتاب ہے جو کہ بہت سادہ اور عام فہم اردو نظم میں لکھی گئی ہے'' ۳ے۔ پروفیسر محمد اعظم لکھتے ہیں: ''اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام تر منظوم ہے'' ۴ے۔ جیسا کہ اس کے تقریظ نگاروں اور دیباچہ نگاروں نے لکھا ہے اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ تمام تر ''منظوم'' ہے۔ اس کے منظوم ہونے کے علاوہ اس کتاب میں کوئی شعری اور تخلیقی حسن تلاش کرنا کارِ مشکل ہے موصوف کوئی معروف شاعر نہ تھے۔ یہ کتاب بھی حفیظ کی ''شاہنامہ اسلام'' کے بحر ہزج مثمن سالم میں لکھی گئی ہے لیکن کتاب میں وزن کے مسائل اور دیگر فنی کمزوریاں بہت کھٹکتی ہیں۔ اس کا پہلا شعر ہی وزن کے حوالے سے ایک جذباتی صدمہ اور جھٹکا لگاتا ہے:

بنا انیس سو سنتالیس میں جب قانون آزادی ہوئی آزاد انگریزوں سے ہندوستاں کی آبادی ۵ے

واقعات نگاری کا انداز کچھ یوں ہے:

اٹھارہ سو نواسی میں ہوا تھا آخرش یہ بھی مسلماں جب نہ یہ بیگار کرنے کو ہوئے راضی
تو اک دم آگئیں اس ڈوگرہ راجا کی سب فوجیں ۶ے

اس منظوم وقائع نگاری میں سوائے اس کے منظوم ہونے کے کوئی تخلیقی وشعری حسن نہیں ہے۔ محض سطحی، بے رس، بے مزہ، بے کیف، بے رنگ اور بے ذائقہ واقعہ نگاری ہے جس کا نہ تو اردو شاعری میں کوئی مقام ہے اور نہ کشمیر کے قومی ادب میں ہی کوئی بار پاسکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

شیخ غلام علی بلبل کاشمیری بانڈی پورمقبوضہ کشمیر میں پیدا ہوئے سری پرتاب کالج سے بی اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس وقت کی ریاست جموں کشمیر کے دور دراز مقامات پر ملازمت کرتے رہے دوسرے عالمی جنگ چھڑنے پر فوج میں کمیشن لے کر چند برس جنگ کے مختلف محاذوں پر رہے پاکستان کی مملکت وجود میں آئی تو آپ پاک آرمی سے وابستہ ہوگئے اور پاکستان ہی کے ہوگئے۔اب عرصہ دراز سے لندن میں مقیم ہیں سید ضمیر جعفری بلبل کاشمیری کے بارے میں ان کے مجموعہ کلام ''دست چنار'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں عصری ادب میں جناب غلام علی بلبل کی وجہ شہرت ان کی مزاحیہ طنزیہ شاعری ہے جس کا مجموعہ ''خندہ گل'' کے نام سے شائع ہوکر اہل نظر میں مقبولیت پا چکا ہے ان کی مزاحیہ شاعری میں بھی بصیرت مند شگفتگی ایک دل کشی جو اس صنف ادب کے ماتھے کا جھومر سمجھی جاتی ہے مگر ان کے ہاں غزلیہ سنجیدگی کی ایک لہر بھی ساتھ ساتھ رواں دواں رہی ہے جس کا سب سے طاقتور اور بھرپور اظہار ان کے ان منظومات میں ظاہر ہوا جو وادی کشمیر کے حوالے سے تخلیق ہوئیں زیر نظر مجموعہ ان کی انھیں تخلیقات پر مشتمل ہے ان سے میرا تعارف ۱۹۳۶ میں ہوا دوسری عالمی جنگ میں اور پھر پاکستان آرمی کی صفوں میں بھی ہم قدمی کی سعادت حاصل رہی ہے۔۷۷؎اسی دیباچے میں سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں جس اخلاص جس تاثیر جس توانائی کے ساتھی وادی کشمیر کا درد بلبل کے لفظوں میں دھڑکتا سنائی دیتا ہے مٹی کا ایسا براہ راست لمس پورے عصری ادب میں کم دکھائی دے گا اظہار کا ایک ریشمی پیراہن بلبل کی شعری شناخت کا حوالہ ہے۔ زیر نظر نظموں میں بھی یہ ریشم سر سراتا تو ہے مگر ایک اداس دھن میں۔۔۔۔۔ یہ لے دل میں اترتی تو ہے مگر خنجر کی دھار کی طرح ان کی نظمیں ہماری تاریخ کے ایک سانحے کی امانت کے طور پر ہماری ادبی میراث میں شامل رہیں گی اور ہماری امنگوں اور عزائم کی نشان دہی میں مدد کریں گی۔نہ اسے ہمارا ادب نظر انداز کرسکتا اور نہ ہماری تاریخ فراموش کرسکتی ہے''۔۷۸؎

ذیل میں بلبل کاشمیری کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

وادی کشمیر کے رنگین نظاروں پر سلام — میری ارض پاک کے تقدیس زاروں پر سلام
آسمانوں سے اُلجھتے کوہساروں پر سلام — برف کے تودوں میں بہتے جوئباروں پر سلام
میری سلماؤں ، زلیخاؤں کی بستی کو دعا — میری یادوں کے چمکتے چاند تاروں پر سلام ۷۹؎

چنار دیس سے ان کی شدید محبت ظاہر کرتے ہوئے ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

محبت کے دیے سیال جہلم میں بہاؤں گا
ولر کی چاندنی راتوں میں ڈل کے گیت گاؤں گا
جواں پھلولوں کے رنگین جھرمٹوں میں چہچہاؤں گا

بنفشی جھاڑیوں کی جنتوں میں ڈوب جاؤں گا
مری محبوب وادی، میں کسی دن لوٹ آؤں گا

میرے نغمے اُڑیں گے پھر تری خاموش راہوں پر
مرے آنسو گریں گے پھر پُرانی خانقاہوں پر
شہیدوں کے مزاروں، غازیوں کی خواب گاہوں پر
کئی برسوں کی بچھڑی دھڑکنوں کی نذر لاؤں گا•
مری محبوب وادی، میں کسی دن لوٹ آؤں گا

میں آؤں گا جلو میں لشکر فتح و ظفر لے کر
ترے برگ و ثمر لے کر، ترے شمس و قمر لے کر
ترے ذروں کا دل بن کر، تری شب کی سحر لے کر
میں تیرے جشن آزادی کے دلکش گیت گاؤں گا
مرے محبوب وادی، میں کسی دن لوٹ آؤں گا ۸۰

بلبل کاشمیری کی ایک نظم ''یادوں کی آگ'' کے عنوان سے دیکھیں:

اچھا بل یاد آ گیا اور ''پاپہ چھن'' یاد آ گیا — تھام لو مجھ کو مجھے اپنا وطن یاد آ گیا
جی میں آتا ہے قفس کی تیلیوں کو نوچ دوں — اس بیاباں میں بہاروں کا وطن یاد آ گیا
اپنے گھر کے سامنے صدیوں کا وہ بوڑھا چنار — بیٹھے بیٹھے آج مجھ کو دفعتاً یاد آ گیا ۸۱

بلبل کاشمیری کا ایک قطعہ پہلگام کے عنوان سے دیکھیں:

دُخترِ دوشیزۂ کوہِ ہمالہ، ''پہلگام'' — کھل گئے ہیں آسمانوں کے دریچے تیرے نام ۸۲

شاعر رومان اختر شیرانی کی مشہور و مقبول نظم کی پیروڈی بھی نہایت دل چسپ انداز میں بلبل کاشمیری نے کی ہے جس میں کشمیر کی تہذیب و ثقافت ایک دکھ کی کیفیت اور Nostalgia دکھائی دیتا ہے:

او دیس سے آنے والے بتا — او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یاران وطن — ڈارانِ وطن ، کاران وطن
شیخانِ وطن ، لالانِ وطن — پیرانِ وطن ، میرانِ وطن
ماگام کے خوش مرغانِ وطن — سنبل کے سیہ چشمانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن

کیا اب بھی تلاش روزی میں پر دیس میں سارے جاتے ہیں
کیا اب بھی پرائے ملکوں میں مزدور ہمارے جاتے ہیں
کیا اب بھی وہ ''ہاتو ہاتو'' سے سب لوگ پکارے جاتے ہیں
سبحان وطن ، رمضان وطن شعبانِ وطن، رحمان وطن ۸۳

کشمیر کی سیاسی تقسیم سے پہلے کے شعرا میں ڈاکٹر عمادالدین سوز بہت اہم شاعر تھے ان کے حوالے سے ''کشمیر میں اردو'' کے منصف حبیب کیفوی لکھتے ہیں۔ جموں کے بلند نظر اور خوش فکر شاعر تھے ان کے بزرگ گلاب سنگھ کے عہد حکومت میں کشمیر آئے اور شاہی حکیم مقرر ہو گئے ان کے نانا داس علی پنجابی اور ڈوگری کے اعلیٰ اور بلند پایہ شاعر تھے۔ جن کے نغموں کی گونج سے آج بھی کوہستان جموں کی فضائیں معمور ہیں۔ ۱۹۴۷ میں ڈاکٹر سوز کو اپنے آبائی وطن جموں ہی کو خیر باد نہیں کہنا پڑا بلکہ دو عزیز ترین جانوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا اس طرح لٹ لٹا کر میر پور میں آ بسے۔۔۔۔۔۸۴

ڈاکٹر سوز کی کشمیر کے حوالے سے متعدد نظمیں ہیں اپنی نظم ''مقبوضہ کشمیر کی تصویر'' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ستم! کہ دست عدو و جفائے دوراں سے خراب جنت کشمیر ہوتی جاتی ہے
سنو کہ بجھ نہیں سکتا شرار آزادی ہر آہ نعرہ تکبیر ہوتی جاتی ہے ۸۵

نظم ''جھیل ڈل'' کے کچھ اشعار:

مہر کی کشتی جو ڈوبی جا کے بحر شام میں مے شفق کے رنگ نے ڈالی فلک کے جام میں
ہر طرف یوں تیرتے پھرتے کنول کے پھول ہیں جیسے اک آئینۂ لرزاں میں ڈل کے پھول ہیں
قید و آزادی کی اک زندہ کہانی ہیں یہ پھول درس آموز مذاق زندگانی ہیں یہ پھول ۸۶

شجر طہرانی کا اصل نام حکیم عبدالبنی ہے ۱۸۷۲ میں اکھنور کے قریب ایک بستی ہمیر پور سدھڑ میں پیدا ہوئے۔ شجر کے بزرگ ایران سے ہمایوں کے ہم راہ ہندوستان آئے تھے۔ یہ خاندان بہادر شاہ ظفر کے عہد تک دلی میں آباد رہا۔ پھر جنگ آزادی کے بعد لاہور پہنچا۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کو خرید لیا تو ان کے بزرگ شاہی طبیب کی حیثیت سے گلاب سنگھ کے ہمراہ جموں آ گئے۔ ان کے والد میرزا امیر الدین امیر فارسی کے اچھے شاعر تھے دادا مرزا امام الدین امام بھی فارسی کے نام ور شاعر تھے۔ گویا شجر طہرانی موروثی شاعر تھے۔ قطعات گوئی کے لیے خاصی شہرت رکھتے تھے کشمیر کے حوالے سے ان کے کچھ قطعات دیکھیے:

آزما کر قوم کی تقدیر بھی دیکھیں گے ہم کفر کے بازو بھی اور شمشیر بھی دیکھیں گے ہم

اے شہیدان وطن! جاتے ہوئے فردوس کو   راستے میں جنت کشمیر بھی دیکھیں گے ہم ۸۷
مضمحل ہے اس لیے تو اس لیے رنجور ہے   قلب پاکستان میں کشمیر کا ناسور ہے
اے مجاہد! نعرہ تکبیر سن یلغار کر   دیکھ لیں گے کون پھر کہتا ہے دلی دور ہے ۸۸

شجر طہرانی کے قطعات میں شعریت بھی ہے اور کشمیر کی محبت اور اس کا درد بھی ہے۔ان دونوں چیزوں نے مل کر ان کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔امرتسر کے کشمیری خاندان سے تعلق رکھنے والے ملک محی الدین قمر قمرازی ملازمت کے سلسلے میں کشمیر گئے تو اس جنت گم گشتہ کو ایک بار پھر اپنا وطن بنا لیا۔تحصیل دار سے ملازمت کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے لداخ کے وزیر کے عہدے تک پہنچ گئے۔آخر عمر میں بصارت سے محروم ہو جانے والے اس کشمیر الاصل شاعر کے کلام میں کشمیر کا موضوع ایک برقی رو کی طرح دوڑتا ہے۔ان کی ایک بہت طویل نظم ''وادی کشمیر'' بہت مشہور ہے ان نظم کی ایک خاص بات اس کے مصرعوں کی مخصوص ترتیب ''ریم سیکم'' بھی ہے [اردو ادب میں اسے مستزاد کہتے ہیں مدیر]۔کچھ اشعار ذیل میں درج ہیں:

رہتا ہوں شب و روز ترے ہجر میں دل گیر   اے وادی کشمیر
وہ صاف، وہ شفاف ترے چشموں کا پانی   پانی کی روانی
لاریب ہے آئینہ تطہیر کی تفسیر   اے وادی کشمیر
وہ سبزہ شاداب کی مخمل کی بساطیں   وہ چاندنی راتیں
مر غانِ نظر کو جو کیا کرتی ہیں نخچیر   اے وادی کشمیر
شب کو لبِ ڈل باغوں کے خوش رنگ نظارے   پھولوں کے کیارے
ان پھولوں میں پھر کر مکِ شب تاب کی تنویر   اے وادی کشمیر ۸۹

ایک اور نظم ''گردش ایام آخر تا بہ کے؟'' سے اقتباس:

گردش ایام آخر تا بہ کے؟   ہم سہیں آلام آخر تا بہ کے؟
بے زباں کشمیریوں کے حلق پر   تیغ خوں آشام آخر تا بہ کے؟ ۹۰

قمر قمرازی کی نظم ''خطاب بہ نوجوانانِ کشمیر'' سے چند اشعار:

یہی تو موقع ہے نوجوانو! کہ نوجوانی دکھاتے جاؤ
پڑیں تو صدمے اُٹھاتے جاؤ، قدم کو آگے بڑھاتے جاؤ
قدم نہ تھم جائے یاں تمھارا، رواں رہے کارواں تمھارا
نہ روک دے تم کو خار و خارا سمند ہمت اڑاتے جاؤ ۹۱

قمر قمرازی کے کلام میں زبان و بیان کا زیادہ لطف نہیں لیکن غنائیت (Melody) کا حسن ضرور کارفرما ہے جس نے کشمیر کے حوالے سے قمر قمرازی کے کلام کو ترانوں اور رزمیہ گیتوں کا رنگ بخش دیا ہے۔ قیس شروانہ (اصل نام ڈاکٹر بشیر محمد خان) جو سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے کشمیری الاصل شاعر تھے۔ ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں کشمیر کا موضوع دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''اے مرے پیارے وطن'' سے کچھ بند:

باغ جنت سے سہانے ہیں ترے کوہ و دمن
بھول جاؤں کس طرح اے غیرت باغ عدن
دل کشی تیری فضاؤں کی، مناظر کی پھبن
آج بھی دل میں، میں آباد ترے سرو سمن

اے مرے پیارے وطن!

ملک کوئی دارِ فانی میں نہیں تیرا جواب
ہیں تری مٹی کے ذرے غیرت درخوش آب
تجھ میں آکر زندہ ہو جاتا ہے ہر مرغ کباب
پرفضا باغوں سے بڑھ کر ہیں ترے شاداب بن

اے مرے پیارے وطن! ۹۲

ان کی ایک نظم ''کشمیر کے شہیدوں سے'' ایک بند۔

پھر یاد آرہی ہیں قربانیاں تمھاری — پھر فرط رنج وغم میں کرتا ہوں آہ زاری!
ہر لحظہ بڑھ رہی ہے پھر دل کی بے قراری — آنکھوں سے بے کلی میں پھر جوئے خوں ہے جاری

تم یاد آرہے ہو کشمیر کے شہیدو ۹۳

جموں سے تعلق رکھنے والے حبیب اللہ کوثر نے جموں میں مسلمانوں کے قتل عام کے حوالے سے نظموں کا ایک مکمل مجموعہ ''ہنگامہ کشمیر'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۵۱ میں پہلا ۱۹۵۲ میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا یہ ۱۹۴۷ کے قتل عام میں خود زخمی ہوئے اور ان کا چھے سالہ بیٹا اپنے دو ہمزادوں سمیت لاپتہ ہوا۔ ان کے کلام میں زبان و بیاں کی کوئی خاص خوبی تو دکھائی نہیں دیتی لیکن اپنے لہو اور اپنے بیٹے کی جان کی قربانی پیش کرنے والے اس شاعر کے کلام میں درد کے سائے نظر آتے ہیں:

حال دل اپنا بتائیں تو بتائیں کس کو — قصہ درد سنائیں تو سنائیں کس کو
دیکھنے والی کوئی آنکھ نظر آتی نہیں — چیر کر دل بھی دکھائیں تو دکھائیں کس کو ۹۴

مرزا مبارک بیگ کی ایک نظم ''قندمکرر'' جو کشمیر کے نام ور شاعر گورنر کشمیر چودھری خوشی محمد ناظر کی ایک نظم کی تضمین ہے، کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

ویران منظروں سے گھبرا گئی ہیں آنکھیں — آتی نہیں ہے منزل اور آ گئی ہیں آنکھیں
سورج کی تیزیوں سے چندھیا گئی ہیں آنکھیں — پتھر کو دیکھنے سے پتھرا گئی ہیں آنکھیں
اب آبشار دیکھیں اور سبزہ زاد دیکھیں — اب جوئبار دیکھیں ابر بہار دیکھیں ۹۵

محمد سعید شاہ بخاری کی نظم ''وادیِ کشمیر'' سے چند اشعار:

میں سراپا درد ہوں میں وادیِ کشمیر ہوں
مجھ کو کیا جنت سے نسبت، ظلم کی جاگیر ہوں
نیم جاں ہوں مضطرب ہوں آہ بے تاثیر ہوں
داغ ہیں میرے کلیجے پر نشاط و شالیمار
خونچکاں ہیں میرے چشمے، سینہ کوباں آبشار ۹۶

۱۹۰۲ء میں اننت ناگ کشمیر میں پیدا ہونے والے کیف دہلوی کے شاگرد اور مقبوضہ کشمیر کے ترقی پسند شاعر پنڈت دینا ناتھ مست، بزم اردو جموں و کشمیر کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ان کی نظم ''ڈل کی ملکہ'' کا ایک بند:

دل ربا، دل چسپ، دل کش روح پرور ہے بہار — گل نگاریں، غنچہ رنگیں، خلد منظر ہے بہار
کیف سامان، سکر افزا، وجد آور ہے بہار — عرش سے لے کر زمیں تک جلوہ گستر ہے بہار
مست ہوں کیفیت رنگ بہاراں دیکھ کر — بےخودی طاری ہے حسن ڈل کو عریاں دیکھ کر ۹۷

پنڈت برج نارائن چکبست پنڈتوں کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو نقل وطن کر کے ہندوستان میں آیا اور قانون اور شاعری میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا ۱۹۰۷ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی اور اس محنت سے کام کیا کہ جلد ہی صف اول کے وکلا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ لکھنؤ کے ادب پرور ماحول میں رہ کر ان کا ادبی ذوق پروان چڑھنے لگا۔ چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کا رنگ موجود ہے۔ اپنے وطن ثانی لکھنؤ میں رہ کر بھی وہ اپنے وطن کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ان کا یہ شعر جو دھڑکنوں میں رچ بس گیا:

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہمان نواز — رہ میں پتھر کے بھی ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے ۹۸

یوں تو کشمیر کے بارے میں ان کا اور بھی کلام مشہور ہے لیکن شہرت دوام مذکورہ بالا شعر کو حاصل

ہوئی۔ کشمیر پر ان کی ایک اعلیٰ پایہ کی نظم ہے جس میں اس کے مناظر کی ایسی عکاسی کی گئی ہے کہ کشمیر کی رعنائی وزیبائی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ایک بند ملاحظہ ہوں:

پانی میں ہے چشموں کے اثر آب بقا کا　　　ہر نخل پہ عالم خضر سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا　　　سائے میں شجر کے ہے اثر ظل ہما کا
ہر لالہ کوہسار ہے شکل گل راحت　　　داغ اس کے یا ہیں خال رخ حور مسرت ۹۹

پیرزادہ غلام مہجور مولانا شبلی نعمانی سے رشتہ تلمذ رکھتے تھے ۱۸۸۵ء میں متر گام (مقبوضہ کشمیر میں پیدا ہوئے صرف مڈل تک پڑھے لکھے تھے اردو فارسی اور کشمیری تینوں زبانوں کے شاعر تھے گورنر کشمیر چودھری خوشی محمد ناظر نے پٹواری بھرتی کرادیا پکے کمیونسٹ ذہن کے اور باغی خیالات کے مالک تھے، انھوں نے ڈوگرہ استعمار کا ملازم ہونے کے باوجود اس فسطائی آمریت کے خلاف آواز اٹھائی۔۱۹۵۲ء میں فوت ہوئے۔کشمیر کے حوالے سے مہجور کے چند اشعار:

شکستہ حالیٔ بغداد پر ہے نوحہ خواں سعدی　　　ہے اندلس کے لیے اقبال محو مرثیہ خوانی
مگر صد حیف اجڑا گلشن اسلام کشمر میں　　　کوئی کرتا نہیں جز آب شبنم اشک افشانی ۱۰۰

اسرائیل مہجور راجوروی جموں کشمیر کی تحصیل راجوری میں مدھل کے رہنے والے تھے۔ان کی نظموں میں کشمیر کے حوالے سے نظموں میں بغاوت اور انقلاب دونوں ہیں۔یہ نظم یوم آزادیٔ کشمیر کی تاسیس اور ریڈیو آزاد کشمیر کے منعقدہ مشاعرہ میں، جو حفیظ جالندھری کی صدارت میں ہوا تھا، پڑھی گئی تھی اور لوگوں نے اسے بے حد پسند کیا تھا:

نہ بھولیں گے وطن کے وہ نظارے　　　وہ شالا مار کے دل کش فوارے
وہ حضرت بل وہ مسجد کے منا رے　　　وہ جہلم اور ولر کے کنارے
جہاں کا چپہ چپہ دل نشیں ہے　　　یہی میرے وطن کی سرزمیں ہے ۱۰۱

کشمیر کے گورنر اور ''جوگی'' جیسی مشہور زمانہ اور لازوال نظم کے خالق چودھری خوشی محمد ناظر کی اکثر نظمیں کشمیر کی منظر کشی کی زندہ جاوید تصویریں ہیں۔ایک نظم جو کشمیر ڈے کی تصویر کشی کرتی ہے کچھ اشعار:

اللہ اللہ ہے کیا حسن چمن پانی میں　　　سبزہ و لالہ و گل ،سرو سمن پانی میں
کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اس میں　　　کوہ پانی میں ،چمن پانی میں، بن پانی میں
تودۂ سیم ہے یہ ڈل کے خزانے میں نہاں　　　بر ف کوہسا رہے یا عکس فگن پانی میں
اک طرف کو ہ یہ ہے تخت سلیماں قائم　　　اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں ۱۰۲

تقسیم کشمیر سے پہلے کی کشمیر کے حوالے سے اردو شاعری کا یہ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اس عہد کے کشمیر کے موضوع پر شاعری میں دو چیزیں زیادہ نمایاں ہیں:

۱۔ حسن کشمیر کی منظر کشی

۲۔ کشمیر کی تحریک جہاد کی تصویر کشی

اس عہد کی اردو شاعری میں کشمیر کے حوالے سے وہ پیچیدہ سوالات نہیں اُٹھائے گئے جو بیسوں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے (حالیہ) عشرے میں اُٹھائے گئے ہیں۔ کشمیر میں جاری ظلم کی منظر نگاری تو کی گئی ہے لیکن سوائے اقبال اور حفیظ کے بہت کم شاعروں نے اس ظلم و بربریت کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اقبال اور حفیظ نے شہری آزادیوں کی پامالی کے پیچھے کارفرما عناصر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اپنے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے اس استحصال کا اصل باعث وہ خواجگی ہے جو شخصی حکمرانوں کے رائج کردہ جاگیردارانہ اور جابرانہ نظام کی بنا پر قائم ہے اور یہ جاگیردارانہ نظام اس وقت تک قائم اور دائم رہے گا جب تک لوگ تعلیم اور انقلابی فکر کی دولت سے متصف نہیں ہوں گے۔ اس عہد کی شاعری میں غالب سے لے کر خوشی محمد ناظر تک شعرا کی نظر جنت کشمیر کے ظاہری حسن پر تو گئی ہے لیکن اس جنت ارضی میں سسک سسک کر جابرانہ نظام کے اندر غلامانہ زندگی بسر کرنے والے کشمیریوں کی طرف معدودے چند شعرا نے توجہ دی ہے۔ اقبال حفیظ اور ترقی پسند تحریک اور بعض دوسری سیاسی تحریکوں (مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس وغیرہ) کے زیر اثر ہونے والی شاعری میں البتہ کشمیر کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کو بھی فوکس کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس عہد کی شاعری خوش رنگ ضرور ہے لیکن زیادہ تر ظاہر کی آنکھ کا تماشہ ہے۔ اقبال حفیظ اور چند دوسرے شعرا نے دیدہ دل وا کیا ہے تاہم ان کے تتبع میں گزشتہ صدی کے نصف آخر میں جو شاعری ہوئی اس میں نظر کی گہرائی اور فکر کا تجسس ضرور نظر آتا ہے۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر افتخار مغل، ''آزاد کشمیر میں اردو شاعری تحقیق وتنقیدی جائزہ'' غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ایم فل اردو، AIOU، ۱۹۹۵ء، ص ا۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۔

۳۔ سید حسام الدین راشدی، ''تذکرہ شعرائے کشمیر''، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷ء، جلد اوّل، ص ا تا ۵۔

۴۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۸۔

۵۔ محمد عبداللہ قریشی، ''کشمیر کی فارسی شاعری'' مقالہ، ادبی دنیا (کشمیر نمبر) لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۹۔

۶۔ خواجہ غلام احمد پنڈت، ''کشمیر: آزادی کی دہلیز پر''، جنگ پبلشرز، لاہور، اوّل ۱۹۹۱ء، ص ۹۷۔
۷۔ غلام نبی خیال، ''محمود گامی''، آزاد آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز اکیڈمی، سری نگر، ۱۹۷۱، ص ۱۰۔
۸۔ ڈاکٹر افتخار مغل، ''آزاد کشمیر میں اردو شاعری تحقیق و تنقیدی جائزہ'' غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ایم فل اردو، AIOU، ۱۹۹۵ء، ص ۸۔
۹۔ ایضاً، ص ۹۔
۱۰۔ محمد عبداللہ قریشی، ''کشمیر کی فارسی شاعری ادبی دنیا (کشمیر نمبر)''، لاہور، شمارہ مارچ/اپریل ۱۹۶۶، ص ۶۶۴۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۶۶۸۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳۰۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۳۴۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۳۷۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۳۸۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔
۱۷۔ ڈاکٹر صابر آفاقی، ''اقبال اور کشمیر''، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۔
۱۸۔ شیخ عطاء اللہ، ''اقبال کا نسب و وطن کا تصور''، علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، جلد ۱۶ / اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۷۹۔
۱۹۔ خواجہ حیدر علی آتش، ''کلیات آتش''، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، سال اشاعت ندارد، ص ۱۹۔۲۰۔
۲۰۔ ناصر کاظمی (مرتبہ)، ''انتخاب نظیر''، فضل حق اینڈ سنز پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۸۲۔
۲۱۔ ڈاکٹر صابر آفاقی، ''اقبال اور کشمیر''، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۴۱۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۴۱۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۴۲۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۴۳۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔
۲۸۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۳۵، ۱۳۶۔
۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۳۲ ایضاً،ص۱۴۱۔

۳۳ ایضاً،ص۱۴۳۔

۳۴ ایضاً،ص۱۴۴،۱۴۵۔

۳۵ ایضاً،ص۱۴۷۔

۳۶ ایضاً،ص۱۴۹۔

۳۷ ایضاً،ص۱۵۰،۱۵۱۔

۳۸ ایضاً،ص۱۵۳۔

۳۹ ایضاً،ص۱۶۱،۱۶۲۔

۴۰ ایضاً،ص۱۶۴۔

۴۱ حفیظ جالندھری،''تصویر کشمیر''،اردو اکیڈمی پنجاب،لاہور،۱۹۳۷ء،ص۴۔

۴۲ ایضاً،ص۸۔

۴۳ ایضاً،ص۱۵۔

۴۴ ایضاً،ص۱۷۔

۴۵ ایضاً،ص۲۳۔

۴۶ ایضاً،ص۲۷۔

۴۷ ایضاً،ص۲۵۔

۴۸ ایضاً،ص۲۱۔

۴۹ ایضاً،ص۲۹۔

۵۰ ایضاً،ص۳۱۔

۵۱ ایضاً،ص۳۰۔

۵۲ ایضاً،ص۳۲۔

۵۳ ایضاً،ص۲۸۔

۵۴ ایضاً،ص۵۸۔

۵۵ ناصر زیدی(مرتب)،''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''،مشمولہ نقوش،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۳۰۔۳۱۔

۵۶ ایضاً،ص۲۸۔

۵۷ ایضاً،ص۲۹۔

۵۸۔ ایضاً،ص۲۹۔
۵۹۔ امین طارق قاسمی، ''جہاد کشمیر''،تعمیری کتب خانہ،راولپنڈی،۱۹۸۳ء،ص۲۳۔
۶۰۔ حفیظ جالندھری، ''تصویر کشمیر''،ص۳۔
۶۱۔ امین طارق قاسمی، ''جہاد کشمیر''،ص۳۴۔
۶۲۔ ایضاً،ص۴۱،۴۲۔
۶۳۔ ایضاً،ص۴۵۔
۶۴۔ ایضاً،ص۶۳۔
۶۵۔ ایضاً،ص۸۰۔۸۱۔
۶۶۔ ایضاً،ص۹۳۔
۶۷۔ ایضاً،ص۱۲۰۔
۶۸۔ ایضاً،ص۱۲۱۔
۶۹۔ ایضاً،ص۱۲۲۔
۷۰۔ ایضاً،ص۱۳۳۔
۷۱۔ خان کفایت اللہ خان جلیس، ''فغان کشمیر''، ہمدرد پریس،راولپنڈی،۱۹۵۳ء،ص۴۔
۷۲۔ ایضاً،ص۶۔
۷۳۔ ایضاً۔
۷۴۔ ایضاً،ص۸۔
۷۵۔ ایضاً،ص۳۳۔
۷۶۔ ایضاً،ص۴۵۔۴۶۔
۷۷۔ ''دست چنار''، پبلشرز کشمیر اکیڈمی،مظفر آباد،۱۹۹۵ء،ص۳۔
۷۸۔ ایضاً،ص۱۱۔
۷۹۔ ایضاً،ص۱۶تا۱۹۔
۸۰۔ ایضاً،ص۲۰تا۲۲۔
۸۱۔ ایضاً،ص۲۷۔
۸۲۔ ایضاً،ص۶۶۔
۸۳۔ ایضاً،ص۶۸،۶۹۔

۸۴ حبیب کیفوی، کشمیری اردو، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۴۳۷۔
۸۵ ایضاً، ص ۴۴۷۔
۸۶ ایضاً، ص ۴۴۸۔
۸۷ ایضاً، ص ۴۵۳۔
۸۸ ایضاً، ص ۴۵۴۔
۸۹ ایضاً، ص ۴۷۰، ۴۷۲۔
۹۰ ایضاً، ص ۴۷۲۔
۹۱ ایضاً، ص ۴۷۳۔
۹۲ ایضاً، ص ۴۷۶، ۴۷۷۔
۹۳ ایضاً، ص ۴۷۷۔
۹۴ ایضاً، ص ۴۸۲۔
۹۵ ایضاً، ص ۴۹۴۔
۹۶ ایضاً، ص ۴۹۷، ۴۹۸۔
۹۷ ایضاً، ص ۵۰۷، ۵۰۸۔
۹۸ ایضاً، ص ۱۱۱۔
۹۹ ایضاً، ص ۱۱۳۔
۱۰۰ ایضاً، ص ۵۲۱، ۵۲۲۔
۱۰۱ ایضاً، ص ۵۲۶، ۵۲۷۔
۱۰۲ ایضاً، ص ۵۳۷، ۵۳۸۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ آتش، حیدر علی: ۱۹۶۲ء، ''کلیاتِ آتش''، مکتبۂ جامعیہ ملیہ، دہلی۔
۲۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، ''آزاد کشمیر میں اردو شاعری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء۔
۳۔ بلبل، غلام علی: ۱۹۹۵ء، ''دستِ چنار''، کشمیر اکیڈمی، مظفر آباد۔
۴۔ جالندھری، حفیظ: ۱۹۳۷ء، ''تصویرِ کشمیر'' اردو اکیڈمی پنجاب، لاہور۔

۵۔ جلیس، خان کفایت اللہ خان:۱۹۵۳ء، ''فغان کشمیر''، ہمدرد پریس، راولپنڈی۔
۶۔ خیال، غلام نبی:۱۹۷۱ء، ''محمود گامی''، آزاد آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز اکیڈمی، سری نگر۔
۷۔ راشدی، حسام الدین، سید:۱۹۶۷ء، ''تذکرہ شعرائے کشمیر''، جلد اوّل، اقبال اکیڈمی، کراچی۔
۸۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر:۱۹۷۷ء، ''اقبال اور کشمیر''، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۹۔ غلام احمد پنڈت خواجہ:۱۹۹۱ء، ''کشمیر۔آزادی کی دہلیز پر''، جنگ پبلشرز، لاہور۔
۱۰۔ قاسمی، امین طارق:۱۹۸۳ء، ''جہاد کشمیر''، تعمیری کتب خانہ، راولپنڈی۔
۱۱۔ کاظمی، ناصر (مرتب):۱۹۹۰ء، ''انتخاب نظیر''، فضل حق اینڈ سنز پبلشرز، لاہور۔
۱۲۔ کیفوی، حبیب:۱۹۸۱ء، ''کشمیر میں اردو'' مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔

رسائل:

۱۔ ''ادبی دنیا''، کشمیر نمبر، ۱۹۶۶ء، لاہور۔
۲۔ ''علی گڑھ میگزین''، جلد ۱۶، اپریل ۱۹۳۸ء، علی گڑھ۔
۳۔ ''نقوش''، ۱۹۹۱ء، لاہور۔